دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ | ماہ شعبان المعظم ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۴ء | عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

۱۸۸۹ء میں علامہ شبلی کے مضمون الجزیہ نے پہلی بار اردو میں تحقیق کا وہ نمونہ پیش کیا جس نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی پوری علمی دنیا میں ہلچل مچا دی، چار سال بعد ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ والا مضمون آیا تو مسلمانوں کو مغربی دنیا کی فریب کاریوں اور غلط بیانیوں کے مسکت جواب سے صرف خوشی ہی نہیں ملی بلکہ اپنی تاریخ کی صداقت پر دلائل کے ساتھ یقین میں اضافہ بھی ہوا۔ ان دونوں مضمونوں نے سرسید کے ارادوں کو بھی اس طرح مہمیز کیا کہ انہوں نے یورپ کی پھیلائی ہوئی تاریخی غلط فہمیوں کے جواب اور تصحیح کے لیے باقاعدہ ایک مجلس قائم کی۔ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ میں اس کی خبر چھپی اور علامہ شبلی کو اس مجلس کے سکریٹری بنائے جانے کا بھی اعلان ہوا۔

***

اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین و معاندین کا سب سے بڑا ہتھیار بلکہ دانستہ اور عمداً اور صریحاً تاریخ سے متعلق جھوٹ اور تدلیس اور اس دیانت عمل کی مسلسل اشاعت رہا ہے، علامہ شبلی نے انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کے خلاف اسی ہتھیار کے استعمال کی سنگینی کو شاید سب سے پہلے محسوس کیا، اسلام کے دفاع کی یہی فکر تھی جو ہمیشہ ان کو بے چین کیے رہی۔ وہ ندوہ آئے تو اس درد کی دوا کی فکر اور بڑھی اور اس کے لیے انہوں نے باضابطہ صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی کی تجویز دہلی کے اجلاس میں منظور کرائی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک ندوہ کا زمانہ اس صیغہ کے وجود کا گواہ ہے، ۱۹۱۴ء میں مولانا صرف ندوہ ہی سے نہیں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی کو وراثت میں اس دارالمصنفین کا جسم دے گئے جس کی روح میں دیکھا جائے تو یہی صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی بسا ہوا تھا۔

***

یادوں کی رہ گزر میں یہ خیالات یوں ہی نہیں متحرک ہوئے۔ انگریزوں سے ملک کو آزادی ملی تو عام توقع تھی کہ تاریخ کے ساتھ خصوصاً اسلام کی تاریخ اور عام طور سے دوسری مشرقی قوموں کی تاریخ کے ساتھ جھوٹ بولنے اور جھوٹ پھیلانے کا عمل رک جائے گا اور ازالہ کے طور پر تاریخ کی ان سچائیوں کو پھر سے روشنی دی جائے گی، جن پر غلط بیانیوں اور دانستہ حقائق کا مکروہ عمل کیا جاتا رہا جن سے جہالت اور تاریکی پھیلائی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ آزادی کے بعد ملک کی اکثریت کا ایک وہ طبقہ جو نسل پرستی میں اور خود کو تمام انسانوں سے برتر سمجھنے میں مورخین یورپ یا مستشرقین کی روش پر گامزن تھا، اس نے یورپ کے اسی

کذب وفریب میں اپنی کامیابی دیکھی اور پھر نصابی کتابوں سے لے کر تاریخ کے تمام موقر اداروں میں ہزاروں سال پہلے کے افسانوں اور اسطوری بیانوں کو تاریخ کے اس اسلوب میں پیش کیا جانے لگا جہاں حوالوں اور کتابیات کا بے محابا عمل اور واقعات وحوادث کی ملمّع سازی کا فن کام میں آتا ہے۔ یہ کام ایسی مہارت سے کیا گیا کہ وہ مورخین جو عرصہ سے اعتبار کی سند لیے ہوئے تھے، وہ دیکھتے دیکھتے تعلیم و دانش گاہوں سے اور کتب خانوں اور کتب فروشوں کی دوکانوں سے دور کر دیے گئے اور پھر وہ وقت آ گیا جب ہندوستان کی تاریخ ہی کو نیست و نابود کر دینے کا شور اٹھا اور اس کو زور بھی ملا، ہر تاریخی سچائی خواہ وہ عمارتوں میں پوشیدہ ہو یا آثار قدیمہ میں زندہ ہو یا پھر وہ شہروں اور قریوں کے نام میں پوشیدہ ہو یا ماضی کے حکمرانوں کے تمدنی جلوؤں سے عیاں ہو، سب یورپ کے اس عمل کی تقلید میں مدہوش ہوگئی جو شاید تاریخ انسانی کا سب سے قابل نفریں عمل ہی کہا جائے گا، مغربی افکار اور استعمار انسانیت کو داغدار اور شرمسار کرنے کے جتنے جرائم کا مرتکب ہوا اس میں تاریخ کی تکذیب واقعی ظلم عظیم ہے اس احساس میں قطعی مبالغہ نہیں۔

***

ملک عزیز میں سرکشی، نفرت اور صرف اپنی طاقت پر غرور نے انسانوں کی جان لینے کا چلن تو شروع ہی کیا، بے زبان عمارتوں کو ڈھانے اور ہر سچ کو جھوٹ بتانے کا جو ماحول تیار کیا ہے اس کی زہرناکی نے مغرب کے سازشی ذہنوں اور ان کے کارخانوں میں ڈھلنے والی جھوٹ کی مصنوعات کی یہاں یاد دلا دی۔ قریب سو سال پہلے پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی کی ایک کتاب کا ترجمہ عبرت کدہ اندلس کے نام سے شائع ہوا تھا، اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا گیا کہ انگریزوں کی تاریخوں میں غلط بیانیوں اور بہتان طرازیوں کی کثرت تو ہے ہی غلط ہونے کے علاوہ یہ مسلمانوں سے شدید بغض، کینے، تعصب اور دشمنی سے بھری ہیں۔ اختلاف بلکہ دشمنی کے اظہار کا بھی ایک طریقہ ہے، لیکن جب معاملہ صرف تعصب اور بغض کا ہو تو مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور ہر برائی اور ہر عیب کو بآسانی ان کی طرف منسوب کر دینا یہ یورپ کے مورخین کی طبیعت ثانیہ بن چکا ہے۔ یہاں مقدمہ نگار کا یہ جملہ بھی قریب ایک صدی پہلے خدا جانے قلم کی کمان سے کیسے نکلا کہ ایک یورپین مستشرق جب بدھ مت یا ہندو دھرم کے متعلق کچھ لکھے گا تو خواہ ان کے خیالات سے متفق نہ ہو تاہم ایک منصفانہ اور سنجیدہ نگاہ ان پر ضرور ڈالے گا مگر سخت حیرت ہے کہ جب وہی مستشرق اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کوئی کتاب لکھتا ہے تو اس کی معقولیت اور سنجیدگی یک قلم رخصت ہو جاتی ہے اور اس کے بجائے غصہ، نفرت اور بغض وعداوت کے جذبات فوراً بھڑک اٹھتے ہیں، وہ نہایت بے باکی سے بدتر سے بدتر الزام لگانے میں ذرا بھی باک محسوس نہیں کرتے۔ اس تعصب کا باعث آخر ہے

کیا؟ جواب میں کہا گیا کہ یہ ان کے پادری یا آج کی زبان میں ان کے مذہبی بابا اور پیشوا ہیں۔ عقیدۂ توحید ان کی ہر بے راہ روی کو روکنے والا تھا، اس لیے عام انسانوں کی محنت کی کمائی کو اپنے خزانوں میں جمع کرنے کے لیے اور اس سے بھی بڑھ کر معرفت الٰہی کی راہوں سے انسانوں کو دور کرنے کی چاہت اور عادت نے ان کو رسول، توحید، کلام توحید اور امت توحید سے عداوت کی راہ دکھاتی رہی۔ صلیبی جنگوں کے اسی پس منظر نے ان کو کبھی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ تحقیق کی راہ سے تصدیق کی وہ منزل پاتے جہاں ان کی نگاہیں دیکھ سکتیں کہ اسلام وحشیوں کا مذہب نہیں اور نہ مسلمان لٹیرے، قزاق اور عیاش ہوتے ہیں، لیکن تعصب جب نام نہاد مذہب کی راہ سے کہیں جگہ بناتا ہے تو پھر تاریخ وتمدن کا حسن چاہے تاج محل جیسا اور اس کی عظمت لال قلعہ جیسی کیوں نہ ہو، گھٹی میں ملایا گیا تعصب نفرت کی دنیا میں سانس لینے پر مجبور کرتا دیتا ہے۔ پھر جو شورہ پشت اور غدار ہوتے ہیں ان کو محسن قوم بتایا جاتا ہے۔ اسی مقدمہ میں کیا خوب لکھا گیا کہ جن عیسائی فتنہ انگیزوں کی ساری عمر، اسپین میں فساد کی آگ بھڑکانے میں بسر ہوئی وہ ان نفرت کے پجاریوں کے نزدیک قوم اور وطن کے دلی خیر خواہ قرار پائے۔ وہ جوڈاکو اور قزاق تھے، ان کو قومی ہیرو کا درجہ دے دیا گیا، ان دسیسہ کار مورخین کو مواد ان مذہبی پیشواؤں سے ملا جو نہایت دھوکہ، مکاری اور دروغ گوئی سے افسانے لکھتے رہے اور اپنے مٹھوں میں جمع کرتے رہے، بعد کے مورخوں نے ان ہی طبع زاد کہانیوں سے اپنی کتابیں لکھیں اور ان کو مستشرقانہ تحقیق ونظر کا نام دے کر مرعوب ذہنوں کے لیے قابل تسلیم شے بنادیا۔ حد ہے کہ کونڈی نام کا سب سے غلط نویس اور دروغ گو مصنف یورپ میں سب سے زیادہ مقبول و مشہور اور ہر دل عزیز ہوا۔ ڈوزی کی نظر میں کونڈی کو عربی سے برائے نام واقفیت تھی، لیکن یورپ کا ہر متنفس اس کے بیانوں کو وحی آسمانی کی مانند ہر غلطی اور نقص سے پاک سمجھتا رہا۔

***

اسپین، کونڈی، ڈوزی اور مستشرقین کی تحقیقات اور ان کے بیانات کی کجی اور کمزوری کو حق پسند محققین ومورخین نے بڑی حد تک تارعنکبوت کی طرح صاف کر دیا، خصوصاً ہندوستان کی اردو دنیا کو ان کے مضر اثرات سے بچانے اور جزیرہ واسکندریہ کی طرح دنیا کے سامنے حقیقت کو پیش کیا گیا۔ لازمی نتیجہ ہے کہ علامہ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی، صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی اور دارالمصنفین کی یاد آئے گی۔ لیکن ملک کے موجودہ حالات میں تاریخ سے جو فاسقانہ اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اس کی تصحیح کے لیے کسی سرسید اور شبلی وسلیمان کی ضرورت ہے؟ اس سوال پر وقت رہتے سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے۔ مکر و فریب اور دروغ گوئی کا ہر وہ جواب جو معذرت خواہانہ ہوگا یقیناً وہ ناپائیدار ہوگا۔

***

مقالات

تفسیر نظام القرآن کے بعض تاریخی پہلو

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دارالمصنّفین، اعظم گڑھ

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کو اللہ تبارک وتعالی کی جانب سے قرآنی علوم ومعارف پر غور وفکر کا خاص ذوق عطا ہوا تھا۔مفسر علام نے جب سے اس کتاب ہدایت پر تدبر وتفکر کا سلسلہ شروع کیا اسی وقت سے وہ اس کتاب ہدایت کے ہوکر رہ گئے اور زندگی پوری اس کے لیے وقف کر دی۔ اپنی ساری علمی، ادبی، فکری اور تحقیقی سرگرمیوں کا محور ومرکز اسی کتاب اللہ کو قرار دیا۔قرآن مجید کے حرف حرف کے لسانی، نحوی، صرفی، ادبی، تہذیبی، شرعی، تاریخی تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ بالخصوص سورتوں کے عمود ومرکزی مضمون اور نظم وربطِ آیات وسور اور ان کے سیاق وسباق کی تلاش میں وقت کے ساتھ کبھی عجلت یا سہل پسندی کو راہ نہ دی، شاید اسی لیے وہ قرآن کی تفسیر مکمل نہ کر سکے۔تفسیر عربی میں لکھی اور اس کا نام تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان رکھا۔عربی میں ہونے کی وجہ سے عربی داں حضرات تک ہی اس کی افادیت محدود تھی۔ اردو داں طبقہ اس سے محروم ہی رہ جاتا، لیکن بعد میں مولانا کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب نے اس کے اجزا کے اردو میں ترجمے کئے اور یہ ترجمے الگ الگ رسائل کی صورت میں شائع ہوئے۔ پھر مولانا نے ان اجزا پر نظر ثانی کر کے اس کو مجموعہ کی شکل میں شائقین کے سامنے پیش کیا۔

عربی تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان سورۃ البقرہ کو دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے ۲۰۰۰ء میں ۲۹۶ صفحات پر مشتمل الگ جلد میں شائع کیا۔اس کے بعد ۱۳/سورتوں پر مشتمل عربی تفسیر اسی ادارہ نے ۲۰۰۸ء میں تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان کے نام سے شائع کی۔اس میں حوالوں کی تخریج بھی کی گئی ہے۔اردو میں تفسیر نظام القرآن، قرآن کی ۱۱۴/سورتوں میں سے صرف چودہ سورتوں پر مشتمل ہے۔زیر نظر مضمون میں اس کے تاریخی پہلوؤں کا ایک تعارف مقصود ہے۔

تفسیر نظام القرآن کا اجمالی تعارف: ہمارے پیش نظر تفسیر نظام القرآن کا عربی اور اردو دونوں نسخہ ہے۔اردو ترجمہ میں کل ۵۶۳ صفحات ہیں۔اس مقالہ میں اردو ترجمہ ہی زیادہ تر ہمارے سامنے ہے۔ البتہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی اصل عربی عبارت کو بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔شروع میں ۳ صفحہ پر مشتمل مترجم کا دیباچہ ہے جس میں انہوں نے اجزائے تفسیر کی حصولیابی،اس کی ترتیب وتدوین اور اشاعتی مراحل کی تفصیلات اور اس میں شامل سورتوں کے اسباب انتخاب بیان کیے ہیں۔اس کے بعد مترجم ہی کے قلم سے ۱۸ صفحوں میں مولانا فراہی کے مختصر مگر جامع حالات زندگی ہیں۔ص ۲۷ سے ۶۶ تک تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے۔مقدمہ اگرچہ ناتمام ہے تاہم اس میں اجمالی طور پر مولانا فراہی نے اکثر وہ اصول بیان کر دیے ہیں جو انہوں نے پیش نظر رکھے ہیں اور ساتھ ہی تفسیر قرآن میں کلیہ اور فہم مطالب میں کلید کی حیثیت رکھنے والی اصولی حقیقتیں بھی واضح کردی ہیں۔مقدمہ میں بنیادی طور پر تفسیر نظام القرآن کی خصوصیات میں نظم قرآن اور تفسیر آیات بالآیات کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔اس کے تحت کل ۱۶ مقدمات شان نزول تفسیر کے خبری مآخذ،تفسیر کے لسانی مآخذ،آسمانی کتابوں کی شرح ایک دوسرے کی مدد سے،قرآن قطعی الدلالہ ہے،مناسبت وترتیب، ہر سورہ میں ایک خاص نظام ہے،احکام وحقائق کے باب میں قرآن اور کتب سابقہ کا تعلق،سورتوں کی مقدار،قرآنی تعلیم کے اصولی مسائل،معروف ومنکر،نظم کی دلالت، اجزائے نظام،سورتوں کے نام اوران کے عمود،تعیین خطاب اور کیفیت نزول کے عناوین سے زیر بحث آئے ہیں۔ص ۶۷ سے ۷۶ تک آیت بسم اللہ کی تفسیر[۱] ہے۔اس کے بعد سورتوں کی تفسیر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سورہ فاتحہ[۲]، ذاریات،تحریم، قیامہ،مرسلات،عبس،شمس، والتین، والعصر،فیل،کوثر، کافرون،لہب اور سورہ اخلاص[۳] کی تفسیر اس مجموعہ میں شامل ہے۔

عربی یا اردو کی عام تفسیروں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ مفسرین نے تفسیریں لکھنے میں سورتوں کی اسی ترتیب کا لحاظ کیا ہے جس ترتیب پر قرآن مجید موجود ہے۔یعنی سورہ فاتحہ،پھر بقرہ،اس کے بعد آل عمران کی تفسیر وغیرہ،اسی ترتیب وانداز کے مطابق تفسیریں لکھی گئی معلوم ہوتی ہیں۔لیکن مولانا فراہی کی

۱۔اس کی تفسیر ناتمام ہے۔مترجم نے دیانت داری کے تقاضہ کے خیال سے اس میں زیادہ تصرف نہیں کیا ہے۔

۲۔اس سورہ کی تفسیر اور مقدمہ سے بعض ایسے حصے ترجمے میں مترجم نے حذف کر دیے ہیں جو بالکل ہی ناتمام یادداشتوں کی شکل میں تھے اور جس کا سمجھنا قارئین کے لیے دشوار تھا۔

۳۔اس سورہ کی تفسیر خود مولانا نے اردو میں لکھی ہے۔

تفسیر نظام القرآن اس عام اسلوب تفسیر سے ہٹ کر ہے۔انہوں نے اس کے برعکس تفسیر نظام القرآن میں سورتوں کے انتخاب کی روش اپنائی اور پہلے ان سورتوں کی تفسیر لکھی جن میں انہوں نے اپنے اصولوں کے مطابق تفسیری حقائق پائے۔جیسا کہ مولانا امین اصلاحی صاحب اپنے دیباچہ میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

قرآن کی جن سورتوں کی تفسیریں اس مجموعہ میں شامل ہیں ان کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ان کا پہلے لکھا جانا اور پہلے شائع ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ مولانا نے قصد وارادہ کر کے تفسیر کے لیے پہلے انہی سورتوں کا انتخاب فرمایا۔اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ وہ فہم قرآن کی راہ کھولنے کے لیے جن اصولی باتوں کو پہلے سمجھانا چاہتے تھے ان میں سے بعض اہم باتوں کے سمجھانے کے لیے ان سورتوں کی تفسیروں میں مناسب مواقع موجود تھے۔چنانچہ جو شخص بھی ان تفسیروں کا غور سے مطالعہ کرے گا وہ ہر سورہ کی تفسیر میں تفسیری حقائق ومعارف کے علاوہ ایسی اصولی باتیں بھی پائے گا جو اگر اچھی طرح قاری کی گرفت میں آ جائیں تو ان سے قرآن کے بہت سے بند دروازے آپ سے آپ کھل سکتے ہیں[۴]۔

تفسیر قرآن کے خبری ماٰخذ میں احادیث،قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات اور گذشتہ انبیا کے صحیفے کے وہ حصے جو تحریف سے بہت حد تک محفوظ ہیں شمار ہوتے ہیں اور ان ماٰخذ کی حیثیت فروع کی ہے اصل کی نہیں ہے۔ان ماٰخذ میں احادیث کے علاوہ دوسرے اور تیسرے کا تعلق اگر کہا جائے کہ براہ راست تاریخ اور تاریخی واقعات ومباحث سے ہے تو بیجا نہ ہوگا۔تاریخ القرآن مولانا کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔اس موضوع پر انہوں نے ایک کتاب خاص اسی عنوان سے لکھی تھی۔اس میں جمع وترتیب اور تاریخ قرآن سے متعلق اپنے نظریات کا مولانا نے مفصل احاطہ کیا تھا۔لیکن افسوس کہ اس کے متعلق اب تک مختصر معلومات ہی دستیاب ہوئی ہیں۔

تاریخ کا یہی وہ پہلو ہے جس کو پیش نظر رکھ کر آئندہ سطور میں گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔یعنی مولانا نے تاریخی واقعات وحالات کو تفسیر کا ماخذ قرار دیا ہے لیکن اس میں قرآن کے بیان کو علم قطعی اور اصل ماخذ کا درجہ دیا ہے۔گویا مولانا کے نزدیک اگر کوئی واقعہ تاریخ اور تواتر سے ثابت ہے اور قرآن سے معارض ہے تو قرآن کی بات صحیح مانی جائے گی۔اس ضمن میں مولانا فراہی نے مقدمہ نمبر۲

۴۔مولانا حمید الدین فراہیؒ تفسیر نظام القرآن،ناشر دائرہ حمیدیہ،مدرسۃ الاصلاح،سرائمیر،۱۹۹۰ء،ص ۷

کے تحت بڑی مدلل، منطقیانہ اور عقلی بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ ان مآخذ میں اگر گمان وشک کا امکان نہ ہوتا تو ان کی حیثیت بھی اصل کی ہوتی۔ مولانا لکھتے ہیں:

> اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فروع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ میں سے ان روایات کو نہ لے جو اصل (قرآن) کو ڈھانے والی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی تاویل نہ کی جائے تو ان کی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے...... لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل تو کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے .... حالانکہ جب اصل وفرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل ...... اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت یا محمدؐ کے خلاف وحی قرآن پڑھنے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارے میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہئے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق وتائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں [۵]۔

اسی طرح ہمارے تفسیری ذخائر میں موجود اسرائیلی مرویات کے سلسلہ میں مولانا فراہیؒ کا صاف اور واضح نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے بجائے اہل کتاب کی تاریخ یعنی توریت وزبور اور انجیل کی معتبر روایات کو ترجیح اور ان کو بہ طور تصدیق وتائید کے پیش کیا جائے، اس لیے کہ ان کے نبیوں کے تاریخی واقعات سے ہمارے مفسرین کو قدرے کم واقفیت تھی۔ لہٰذا تفسیری روایات کے مقابلہ میں اہل کتاب کی معتبر کتابوں کو مآخذ بنایا جائے۔ لکھتے ہیں:

> اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے یہاں پھیلی ہوئی ہیں ان کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے کیونکہ مفسرین نے بالعموم یہ روایتیں ایسے لوگوں سے نقل کی ہیں جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ ان کے بے اصل افسانوں کے بجائے ان کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تائید کے طور پر پیش کریں اور

۵۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن ۳۹

جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں ان کو چھوڑ دیں کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کتابوں میں حق کو چھپایا گیا ہے......اس طرح کے کتمان وتحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کے معاملہ میں موجود ہے۔پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دیں گے۔اس اصول میں کسی کے لیے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔[۶]

آیت بسم اللہ معنوی لحاظ سے قرآن سے پہلے منقول ہے: آیت بسم اللہ کے سلسلہ میں مفسرین نے مختلف لحاظ سے بحثیں کی ہیں۔کسی نے اس آیت کو سورہ فاتحہ کا جزء مانا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ یہ ہر سورہ کا تاج ہے اور کسی کے نزدیک دوسری سورتوں کے شروع میں یہ زائد ہے وغیرہ وغیرہ۔مولانا فراہی کی تفسیر میں اس آیت کا تاریخی پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔انہوں نے یہ تاریخی نکتہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت معنیٰ کے لحاظ سے بہت پہلے سے موجود یا منقول ہے لیکن بعض جعلی کتابوں میں اس کے موجود ہونے کا مدلل رد بھی کیا ہے۔یہ بحث عام طور پر دوسرے مفسرین کے یہاں نظر نہیں آتی۔ان کے الفاظ میں:

> اپنے معنیٰ کے لحاظ سے یہ آیت نزول قرآن سے پہلے سے منقول چلی آتی ہے۔حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو نامہ لکھا اس میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ (یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ خدائے رحمان و رحیم کے نام سے شروع ہے) مجوس کی کتاب ''اوستا'' میں بھی یہ موجود ہے لیکن اوستا کا اعتبار نہیں۔یہ جعلی کتاب ہے۔اہل نظر اس کے جعلی ہونے سے اچھی طرح واقف ہیں۔خود مجوس میں سے بھی تھوڑے سے لوگ اس کو مانتے ہیں[۷]۔

اسم ''اللہ'' کا مفہوم ومعنی اور یہود ونصاریٰ کا طرز عمل: اس آیت کے ضمن میں اسم ''اللہ'' کی اصل اور اس پر لغوی بحث کے بعد اس کی تاریخی نوعیت یعنی عربوں میں اس لفظ کی دینی اہمیت اور یہودیوں اور عیسائیوں کے اس لفظ کے ساتھ طرز عمل اور اس کے مخصوص معنی ومفہوم میں ان کی من مانی تاویلات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لفظ دین صحیح کے ان باقیات صالحات میں سے ہے جو عربوں کو وراثت میں ملی تھیں۔یہود ونصاریٰ نے اس لفظ کو ضائع کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کے یہاں کوئی خاص لفظ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔وہ اللہ کا لفظ غیر اللہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔چنانچہ لفظ اللہ ان کے یہاں ''سید'' کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے[۸]۔اتنا ہی نہیں اس لفظ

۶۔ماخذ سابق ص ۴۰

۷۔تفسیر آیۃ بسم اللہ ص ۶۹

۸۔ماخذ سابق ص ۴۷

میں یہودیوں نے جوخرافات ملا رکھا ہے اس کی تاویل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔مولانا کے یہ قول جہاں جہاں عفریت، جبار وغیرہ کے الفاظ ہونے چاہئیں وہاں ''اللہ'' اور ''ایل'' کے الفاظ ٹھونس دیے ہیں۔ گویا ''اللہ'' کے لفظ کی بنی اسرائیل کے یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔اللہ کے لیے ان کے یہاں غیر مشترک اور مخصوص نام صرف ''یہوہ'' ہے لیکن اس کے حروف وحرکات کے بارے میں بڑے اختلافات وشبہات ہیں اور اس کا تلفظ بھی ناممکن سمجھا جاتا ہے۔یہود اس نام کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے کے سبب اس کو اسم اعظم قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اس کو عام طور پر زبان پر لانا جائز نہیں۔جماعت کے سامنے سال میں صرف ایک مرتبہ یہ نام لیا جاتا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں اس کا استعمال عام ہو جائے اس کو حرکات سے مجرد کر دیا گیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بالکل مجہول ہو کے رہ گیا۔جب کبھی تلاوت میں یہ لفظ آتا ہے اس کی حرکات کی ناواقفیت کی وجہ سے یہود اس کو ادا نہیں کرتے اور صحیح قرأت چھوڑ کر اس کے بدلہ ''اودنیم'' پڑھتے ہیں۔کس قدر عبرت انگیز مقام ہے کہ ان لوگوں نے نہ صرف اللہ کی کتاب ضائع کردی بلکہ اللہ کے نام کو بھی ضائع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔[9]

نصاریٰ کی فاتحہ: سورہ فاتحہ کو مولانا فراہیؒ گوہر آبدار تصور کرتے ہیں اور اس گوہر آبدار کے تابناک پہلوؤں کا استقصاء دو فصلوں میں کیا ہے۔ان کے مطابق یہ سورہ علوم سہ گانہ توحید، رسالت اور معاد کی جامع ہے۔یہ تکمیل نماز کی سورہ ہے۔یہ سورہ نظم قرآن کا نمونہ ہے اور یہ ہر مسلمان کے سینہ میں محفوظ رہنی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ان تفسیری مباحث کے علاوہ اس بحث کا ایک تاریخی اور قابل ذکر پہلو تفسیر نظام القرآن میں یہ بھی ہے جس میں مولانا فراہی نے نماز اور فاتحہ کی تاریخ پر مجملاً معلومات بہم پہنچائی ہیں اور تاریخی پہلو پر تدبر کرتے ہوئے ان کا طائر تخیل اس مقام تک جا پہنچا جہاں تک عام مفسرین کا فکر رسا پہنچنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ سورہ فاتحہ کی تفسیروں کے مطالعہ میں تاریخی نقطہ نظر کی یہ تفصیل کسی اور مفسر کے یہاں دیکھنے میں نہیں ملی کہ عیسائیوں کی نمازوں میں بھی فاتحہ جیسی چیزیں شامل تھیں۔مولانا فراہیؒ نے سورہ فاتحہ کا تقابل نصاریٰ کی فاتحہ سے کیا ہے جس کا مطالعہ قارئین تفسیر نظام القرآن میں کر سکتے ہیں۔یہاں نصاریٰ نے اپنی فاتحہ کے ساتھ جو برتاؤ کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ گم راہ ہوئے، اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔لکھتے ہیں:

۹۔ ماخذ سابق تفسیر سورہ فاتحہ ص ۶۷

جہاں تک نماز کی تاریخ معلوم ہے ہم کو کوئی نماز ایسی نہیں معلوم جو فاتحہ کی روح سے خالی ہو۔اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں اور امت کے حال پر کیسی بے پایاں شفقت ہے حضورؐ کی کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو نماز بغیر فاتحہ ہو، ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے۔تا کہ لوگوں پر نماز کے لیے اس عنصر کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے اور اس کو یہود و نصاریٰ کی طرح چھوڑ نہ بیٹھیں۔یہ چیز نصاریٰ کی کتابوں اور ان کے انبیاء کی تعلیم میں بھی موجود تھی لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں پہچانی......ان لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنی نمازوں میں من گھڑت دعائیں داخل کر لیں۔ان میں بار بار تبدیلیاں کیں اور پھر ان کی وجہ سے طرح طرح کے جھگڑے اور فتنے برپا کیے۔لیکن اس امت پر یہ اللہ کا خاص فضل واحسان ہے کہ اس کے اندر کا کوئی گروہ اس سورہ کی عظمت و اہمیت سے غافل نہیں ہے۔[۱۰]

انبیاء کی آزمائش تاریخ سے ثابت ہے: نبیوں کی آزمائش کا علم قرآن سے ہوتا ہے۔ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں انبیاء کی نام بہ نام آزمائشوں کا تذکرہ موجود ہے۔حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک اور حضرت ابراہیمؑ سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے آنحضورؐ تک کوئی نبی یا رسول ایسا نہیں گذرا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی بھٹی میں نہ تپایا ہو۔چنانچہ مولانا فراہیؒ نے اس پہلو کو تاریخ سے اس طرح ثابت کیا ہے کہ ان کی آزمائشوں کا ذکر یہود کے صحیفوں میں مذکور ہے۔دوسرے یہ کہ آزمائش اللہ کی سنت ہے، اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔تیسرے یہ کہ صحف انبیاء کی تائید قرآنی آیات سے بھی ہوتی ہے۔پانچویں تاریخ ان کی آزمائشوں اور ان کے صبر واستقامت کی تاریخ سے بھری پڑی ہے۔چنانچہ مولانا فراہیؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

حضرت آدمؑ کی آزمائش جنت والے درخت سے ہوئی۔نوحؑ کو ان کے بیٹے کے بارے میں آزمایا گیا۔حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی آزمائش کی تفصیل یہود کے صحیفوں میں مذکور ہے۔یہاں تک کہ ان حضرات کی آزمائش یہ بھی تھی کہ ان لوگوں نے یردن کے اسی پار انتقال کیا۔حضرت ایوبؑ کے شکوے سفر ایوب میں دیکھو۔حضرت یحییٰؑ کی آزمائش ان کے قتل سے ہوئی۔حضرت عیسیٰؑ کی ساری زندگی آزمائشوں سے بھری پڑی ہے۔آخری چالیس دن تک اللہ نے ان کا نہایت کڑا امتحان لیا۔ان کے علاوہ ان کی امت کو بھی اللہ نے طرح طرح سے آزمایا اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان میں

۱۰۔ماخذ سابق ص ۸۱

جو اہل ایمان نکلے ان کو راہ حق پر ثابت قدم رکھا۔ سورہ بروج میں اس بات کی طرف اشارات موجود ہیں اور تاریخ تو ان آزمائشوں اور ان کے صبر و استقامت کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔[۱۱] وقد فتنت امته كثيرا وثبت الله المؤمنين والمؤمنات منهم كمااخبرت به سورة البروج وشهدت به وقائع جمة۔

قوم لوط پر اصل عذاب کے متعلق قرآن و تورات کے بیان میں تضاد کی حقیقت: دنیا کی متعدد قوموں پر نبیوں کی تکذیب، نافرمانی اور حکم عدولی کے نتیجہ میں جو عذاب آیا اس کا تذکرہ قرآن نے نہایت جامع الفاظ و اسلوب میں کیا ہے اور ہر جگہ ایجاز و اختصار کا پہلو ملحوظ ہے۔ اس کا تعلق قوموں کی تاریخ سے ہے۔ اس کا مقصد محض عبرت و موعظت ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے جتنا ضروری تھا اتنے ہی پر قرآن میں اکتفا کیا گیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے سورہ ذاریات میں قرآن مجید کے الفاظ و اسلوب پر تدبر و تفکر کے بعد لکھا ہے کہ قوم لوط کی ہلاکت غبار انگیز ہوا سے ہوئی جو سخت ہو کر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی) تند ہوا بن گئی۔ تفصیل مولانا کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو سخت ہو کر بالآخر حاصب (کنکر پتھر برسانے والی) بن گئی۔ اس سے اول تو ان کے اوپر کنکروں کی بارش ہوئی۔ پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے اس کے مکانات بھی الٹ گئے۔ چنانچہ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ فمنهم من ارسلنا عليه حاصبا (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر پتھر برسانے والی آندھی بھیجی) نیز فرمایا ہے، فجعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليهم حجارة من سجيل منضود (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر تہ بہ تہ سنگ گل کے پتھروں کی بارش کی) یعنی ایسی تند ہوائیں چلیں کہ ان کے مکانات اور چھتیں سب زمین کے برابر ہوگئیں اور اوپر سے کنکریوں اور ریت نے ان کو ڈھانک لیا۔ جیسا کہ فرمایا ہے والمؤتفكة اهوى فغشاها ماغشى (اور الٹی ہوئیں بستیاں جن کو الٹ دیا اور پھر ان کو ڈھانک دیا)[۱۲]۔

حالانکہ عام طور پر مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ سب سے پہلے ایک ہیبت ناک چیخ اٹھی۔ اس کی وجہ سے پوری بستی تہ و بالا ہوگئی۔ اس کے بعد اس پوری بستی کو اوپر لے جا کر زمین پر پٹخ دیا گیا اور اس

۱۱۔ امام عبدالحمید فراہیؒ تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان، دائرہ الحمیدیہ، اعظم کرہ یوپی الہند الطبعۃ الاولیٰ ۲۰۰۸ء ص ۱۱۴۔

۱۲۔ ماخذ سابق سورہ ذاریات ص ۱۲۹

پر پتھروں کی خوب بارش کی گئی۔لیکن تورات کے مترجمین کا بیان ہے کہ قوم لوط آگ اور گندھک کے عذاب سے دوچار ہوئی۔مولانا فراہیؒ نے اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بہ ظاہر قرآن اور تورات کے بیان میں جو اختلاف وتضاد نظر آتا ہے وہ ترجمہ کا نقص ہے۔اس کی دلیل یہ دی ہے کہ تورات میں اکثر رعد وبرق کو آگ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔لکھتے ہیں:

قوم لوط پر جس چیز کی بارش کی گئی اس کے بارہ میں تورات کا بیان قرآن کے بیان سے مختلف ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ان دونوں کے درمیان جو اختلاف نظر آتا ہے وہ محض ترجمہ کی خرابی کا نتیجہ ہے۔تورات کے مترجمین اچھی طرح نہیں سمجھ سکے کہ قوم لوط پر کیا چیز برسائی گئی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے اس کو آگ اور گندھک بنا دیا۔حالانکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مترجمین نے جس کو آگ کہا ہے یہ رعد اور برق ہی ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ تورات میں اکثر رعد وبرق کو آگ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس کی شہادت ان نشانیوں کی تفصیلات کے سلسلہ میں موجود ہے جو حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دکھائی تھیں......ہمارے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تورات میں جہاں حضرت موسیٰؑ کی اس نشانی کا ذکر آیا ہے وہاں اگرچہ اولے اور کڑک کا تذکرہ سات مرتبہ ہوا ہے لیکن ایک مرتبہ بھی اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے کہ اس آگ نے کسی چیز کو جلایا ہو......رہی وہ بات جو لوط کی بستی کے سلسلہ میں تورات میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے دور سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تو اس سے مراد سیاہ غبار ہے جو دور سے دھوئیں کی صورت میں نظر آیا۔رہی گندھک جس کا ذکر کتاب پیدائش ۱۹۔۲۴ میں ہے کہ ’’تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی‘‘ تو اس سے مراد پتھر ہے جس کا ترجمہ مترجموں نے گندھک کیا ہے وہ دراصل حصباء ہے جس کے معنیٰ سنگ ریزے کے ہیں۔یہیں سے انگریزی زبان مین برم سٹون (BRIM STONE) اصل معنیٰ کی تعیین میں بھی غلطی ہوگئی۔ لوگوں نے اس لفظ کے حقیقی معنیٰ جلے ہوئے پتھر کو چھوڑ دیا اور گندھک کے معنیٰ میں استعمال کرنے لگے۔حالانکہ تورات میں اس بات کی نہایت واضح شہادت موجود ہے کہ اس سے مراد پتھر ہیں۔ سفر ایوب ۱۸۔۱۵ میں شریروں کی ہلاکت کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں ’’وہ جو اس کا نہیں (یعنی اجنبی ہے) اس کے ڈیرے میں بسے گا،اس کے مکان پر گندھک چھترائی جائے گی۔‘‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قبر پر پتھر چنے جائیں گے جیسا کہ دستور ہے ورنہ قبر پر گندھک چھترانے کا بھلا کیا مفہوم ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ قوم لوط پر اللہ تعالیٰ نے سنگریزے برسانے والی آندھی کا

عذاب بھیجا جس نے ان کو اور ان کے مکانوں کو ڈھانک لیا اور اگر اس کے ساتھ تورات کا بیان بھی ملا لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے اوپر حاصب کے ساتھ ساتھ برق و رعد کا عذاب بھی آیا۔[۱۳]

مولانا فراہیؒ نے قوم لوط پر عذاب کی حقیقت واضح کرنے کے لیے تورات کے بیان سے جو شواہد پیش کیے ہیں اس سے تورات کی زبان و تعبیر کے مطالعہ کے ساتھ اس مسئلہ پر ان کی مؤرخانہ نظر کا بھی علم ہوتا ہے۔ یعنی اپنے خیالات کی توثیق و تائید کے لیے مولانا نے براہ راست تورات کے تاریخی بیانات کو تسلسل کے ساتھ دیکھا۔ البتہ اس ضمن میں احادیث اور دوسری کتب تفسیر میں جو تفصیلات وارد ہیں ان سے پہلو تہی اس لیے کی ہے کہ مولانا نے بنیادی طور پر اپنے اس موقف کے مطابق تورات کو ماخذ بنایا ہے جس کے پیش نظر وہ مفسرین کی روایات کے بالمقابل گذشتہ صحیفوں کے بیانات و اشارات کو ترجیح دیتے ہیں۔

اسی طرح قوم نوح، عاد و ثمود اور قوم فرعون پر جو عذاب آیا اس میں اہم رول ہواؤں کے تصرف کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس نقطۂ نظر کے پیچھے تورات کے تاریخی بیانات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ خداوند نے رات بھر پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصہ ہو گیا۔ اسی کے آگے تورات میں یہ ہے کہ اس نے مصر کے لشکر اور ان کے گھوڑوں اور رتھوں کا کیا حال کیا اور کیسے اس نے بحر قلزم[۱۴] کے پانی میں ان کو غرق کیا جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے اور خداوند نے ان کو کیسا ہلاک کیا کہ آج کے دن تک وہ نابود ہیں[۱۵]۔

یہاں ایک قدیم تاریخی بحث یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کس مقام پر سمندر عبور کیا تھا۔ جمہور مؤرخین و مفسرین نے خلیج سویز کا مقام تسلیم کیا ہے لیکن مولانا فراہی کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انہوں نے خلیج عقبہ کو عبور کیا۔ مولانا کا یہ نظریہ ان کے تفردات میں شامل اور جمہور سے ہٹ کر بالکل یہ نیا نظریہ ہے جو عام قارئین کے لیے اس لیے استعجاب انگیز ہے کہ مولانا نے یہاں کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ اسی طرح جدید علما کے اس خیال کا کہ اللہ نے جزر کے ذریعہ موسیٰؑ کو نجات اور مد کے ذریعہ فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا، رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہم نے دوسری جگہ ان دونوں خیالات کی مفصل تردید کی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کو مولانا کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں میں یہ تفصیلات نہیں ملیں۔

۱۳۔ تفسیر سورہ ذاریات ص ۱۳۰-۱۳۱

۱۴۔ مولانا فراہی نے "میاہ بحر سوف" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دیکھیے تفسیر نظام القرآن (عربی) سورہ ذاریات ص ۱۵۶

۱۵۔ ماخذ سابق تفسیر سورہ ذاریات ص ۱۳۱-۱۳۲

مولانا نے اس پر ترجمہ میں مفصل نوٹ بھی تحریر کیا ہے۔[۱۶]

حفاظت قرآن کے متعلق فرقہ امامیہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت و تردید: قرآن مجید کی حفاظت اور اس کی تدوین و ترتیب کا مسئلہ عقائدی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہے کہ اس کی اصل ترتیب و تدوین کب ہوئی؟ کس نے یہ فریضہ انجام دیا؟ پھر اس کی حفاظت وصیانت کا کیا معاملہ ہے؟۔ مولانا فراہیؒ نے ان تمام امور و مسائل پر سورہ قیامہ کی ''اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ'' کی تفسیر کے ذیل میں مفصل گفتگو کی ہے۔ان کے بیان کے مطابق قرآن مجید محمدﷺ کے عہد میں جمع ہوکر ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپؐ کو سنایا جاچکا تھا۔جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح آپ کو سنایا گیا تھا اسی طرح آپؐ نے اس کو پڑھا۔پھر آخر میں حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو پورا قرآن اس کی اصلی ترتیب کے مطابق سنا دیا۔یہ بات متفق علیہ روایات سے ثابت ہے۔آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی ،تحریف و تبدیلی یا اس کے کسی حصہ کے غائب ہونے کا امکان باقی نہیں ہے۔اس کے باوجود شیعہ فرقہ امامیہ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ان کے خیال میں قرآن مجید کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا ہے۔مولانا فراہیؒ اس فرقہ پر اس الزام کو صحیح نہیں مانتے اور اس کو وہ قرآن کی الٰہی حفاظت کے منافی خیال کرتے ہیں ۔چنانچہ ان پر اس بے بنیاد الزام کی مؤرخانہ تردید اس فرقہ کے اکابر علما کے اقوال کی روشنی میں کی ہے۔لکھتے ہیں:

> قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔نہ اس میں ایک نقطہ کا اضافہ ہوا ہے نہ ایک شوشہ کی کمی واقع ہوئی ہے۔یہ جو امامیہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علما کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔سید مرتضٰی ،شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی ،ابوعلی طبرسی صاحب مجمع البیان ،محمد بن علی بن بابویہ قمی سب نے اس لغو خیال کی پوری شدت کے ساتھ تردید کی ہے۔محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں۔ ''ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبرﷺ پر اتارا بعینہ وہی قرآن ہے جو مابین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا۔جو شخص ہماری طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے۔''اس بارے میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے متعلق سید مرتضٰی کہتے ہیں ''امامیہ اور حشویہ میں سے

۱۶۔دیکھیے حاشیہ تفسیر سورہ ذاریات ص ۱۳۲

جن لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ان کے سارے اختلافات کا مدار اصحاب روایات کی چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ حضرات صحیح سمجھتے ہیں۔حالانکہ ان روایات کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کے ساتھ معلوم ہے۔" سید مرتضیٰ نے اس پر دوسری دلیلیں قائم کی ہیں لیکن یہاں ہم ان کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتے۔ہماری کتاب تاریخ القرآن [۱۷] میں تمام ضروری تفصیلات ملیں گی۔یہاں ہم مسئلہ سے اسی حد تک بحث کرتے ہیں جتنا سورہ کے اس مقام کے لیے ضروری ہے [۱۸]۔

تین اور زیتون مقامات کے نام ہیں؟: سورہ والتین میں اللہ تعالیٰ نے تین، زیتون، طور سینین اور بلد الامین کی قسم کھائی ہے۔تین عام زبان میں انجیر کو کہتے ہیں اور زیتون بھی ایک پھل کا نام ہے۔بیشتر مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے۔طور سینین اور بلد الامین کا مقام ہونا واضح ہے لیکن بعض مفسرین نے تین اور زیتون سے وہ علاقہ مراد لیا ہے جہاں انجیر اور زیتون کی پیداوار ہوتی ہے اور اسی خطہ میں جلیل القدر انبیاء پیدا ہوئے۔یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ تین سے مراد جبل تین ہے جو کوہ جودی یا اس کے قریب کا کوئی دوسرا پہاڑ ہے جہاں طوفان نوح آیا اور زیتون سے مراد بیت المقدس کا پہاڑ کوہ زیتون ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی تکذیب کے نتیجہ میں یہودیوں سے آسمانی بادشاہت چھینی گئی تھی۔مولانا فراہیؒ نے ان کو مقامات ہی سے تعبیر کیا ہے اور اس کی متعدد تاریخی دلیلیں بھی دی ہیں کہ تین اور زیتون مقامات ہی کے نام ہو سکتے ہیں۔پھر تین اور زیتون کا طور سینین اور بلد امین سے باہمی ربط بھی اس کے مقام ہونے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔اس کے علاوہ مقامات کا تذکرہ کر کے ان واقعات کو جہاں یہ پیش آئے یاد دلانے کے اسلوب سے اہل عرب مانوس تھے۔اشعار عرب اور قرآن میں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔خود تورات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جن سے ان کا مقام ہونا ثابت ہوتا ہے [۱۹]۔ذیل میں تین اور زیتون کے متعلق تاریخی بحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

تین پر تاریخی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تین ایک خاص مقام کا نام ہے۔عرب اس کو اسی نام سے جانتے ہیں۔نابغہ ذبیانی نے اپنے اشعار میں تین کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس میں اس نے تین سے

۱۷۔مولانا کی اس کتاب کے متعلق سطور بالا میں مختصر معلومات بہم پہنچائی جا چکی ہے۔

۱۸۔تفسیر سورہ قیامہ ص ۲۱۱۔۲۱۲۔

۱۹۔دیکھئے تفسیر سورہ والتین ص ۳۱۰۔۳۱۱

شمال کا ایک پہاڑ جو حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے مراد لیا ہے۔ ابوحنیفہ دینوری نے اس مقام کے کے بلاد غطفان سے دوری کے سبب اس رائے سے اختلاف کیا ہے لیکن مولانا فراہی کہتے ہیں کہ یہ اختلاف بالکل بے حقیقت ہے۔ اس لئے کہ نابغہ کے اشعار میں کابل، سدیاجوج اور تدمر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جو بلاد غطفان سے کافی دور ہیں۔ اسی طرح صاحب معجم البلدان نے بھی ابوصعترہ بولانی کے شعر

فمانطفة من حب مزن تقاذنت　　　به جنبتا الجودی والیل دامس[۲۰]

میں مستعمل لفظ جودی سے یمن کا کوئی مقام مراد لیا ہے۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ شعرا اپنے وطن سے دور کے مقامات کا ذکر نہیں کرتے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ یمن میں جودی کے نام سے کوئی مقام ہے ہی نہیں۔ اس کے بعد اپنے خیال کی تائید میں حضرت عباسؓ کا یہ قول کہ تین سے مراد حضرت نوحؑ کی وہ مسجد ہے جو کوہ جودی پر بنی تھی اور حضرت عکرمہؓ تین اور زیتون کو پہاڑ مانتے ہیں پیش کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ تورات کا وہ بیان بھی نقل کیا ہے جس میں ہے کہ بنی آدم نوح کے بعد ادھر ادھر متفرق ہوئے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کوہ جودی کے پاس پیش آیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جبل تین حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کا مسکن تھا۔ اس قیاس کی مزید تائید تورات سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ آدم خود کو ڈھکنے کے لیے اپنے اوپر انجیر کی پتیاں سی لیتے تھے[۲۱]۔ اسی طرح ان کی تحقیق کے مطابق زیتون بھی ایک مقام کا نام ہے۔ اپنے خیال کی تائید انجیل سے حاصل کی ہے اور لکھا ہے کہ زیتون یقیناً وہی پہاڑ ہے جس کا انجیل میں اکثر ذکر آتا ہے اور جس پر حضرت عیسیٰؑ نے بار ہا دعائیں کی ہیں۔ چنانچہ لوقا ۲۱:۳۷ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اور دن میں وہ ہیکل کی تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ پر شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہ زیتون ہے[۲۲]۔ یہاں مولانا فراہی نے حضرت عباس اور عکرمہ کی جو روایتیں نقل کی ہیں ان کی تائید تورات کے بیانات میں موجود ہے۔ اس سے تفسیری روایات کے بالمقابل تورات وغیرہ کے بیانات کو ترجیح دیے جانے کے ان کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔

۲۰۔ عربی نسخہ میں یہ لفظ ''تفاذقت'' ہے۔ دیکھئے ص ۳۴۶۔ بحوالہ شرح الحماسہ للمرزوقی ۱۲۸۱۔

۲۱۔ تفسیر سورہ والتین ص ۳۱۱۔۳۱۲۔ مولانا فراہی نے کان یخصف کے الفاظ نقل کیے ہیں جس کے مفہوم میں انجیر کے پتوں سے خود کو سی لینے کا مفہوم شامل ہے۔

۲۲۔ ماخذ سابق ص ۳۱۲۔

عام مفسرین سے ہٹ کر تین اور زیتون کے مقام ہونے کے دلائل جزا وسزا کے معاملات سے بھی فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ تین وہ پہلا مقام ہے جہاں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینونہ یعنی جزا وسزا کا معاملہ پیش آیا۔ شیطان کی بات مان لینے کے بعد حضرت آدم اور ان کی بیوی کو جزا وسزا کے قانون سے دوچار ہونا اور اللہ کی سرفرازی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جنت کی خلعت سے محروم بھی ہوئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ تورات میں ہے کہ جس درخت کے پتوں سے انہوں نے بدن ڈھانکا تھا وہ انجیر کا ہی درخت تھا۔ پھر اللہ نے توبہ قبول کی اور ہدایت الٰہی پر عمل کے نتیجہ میں اجر کا وعدہ کیا۔ جبل تین کے پاس جزا کا دوسرا واقعہ حضرت نوحؑ کے عہد میں پیش آیا۔ ان کے زمانہ میں اسی مقام پر اللہ نے ظالموں کو تباہ کیا اور نیکوکاروں کو نجات اور برکت بخشی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین اللہ تعالیٰ کے قانون جزا وسزا کا ایک یادگار مقام ہے اور اس کو تین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ رہا زیتون کا معاملہ تو اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ کوہ زیتون پر جزا کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ اسی پہاڑ پر اللہ نے یہود سے اپنی شریعت کی امانت چھین کر سلسلۂ ابراہیمی کی دوسری شاخ کے حوالہ کردی۔ مولانا نے اس کی دلیل زبور کے حوالہ سے حضرت عیسیٰؑ کی زبانی فراہم کی ہے کہ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی پادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔ اس آسمانی بادشاہت کے چھینے جانے کا واقعہ کوہ زیتون پر پیش آیا۔ انجیلوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔[۲۳]

فطرت کے دلائل کو تاریخی واقعات سے قوت پہنچانے کا قرآنی اسلوب: قرآن مجید نے اپنا پیغام انسانوں کو سمجھانے کے لیے متعدد اسالیب اختیار کیے ہیں جن کو اچھی طرح سمجھنا قرآنی طالب علموں کے لیے ضروری ہے۔ فہم وتفہیم اسلوب مفسرین کا بہت محبوب وپسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس موضوع پر ایک عرصہ سے غور کیا تھا اور اسالیب القرآن کے نام سے ایک رسالہ بھی سپرد قلم کیا۔ ان تفسیری اجزا میں جگہ جگہ اس کتاب کا تذکرہ ہے۔ ایک جگہ مظاہر فطرت ہوا، ابر، زمین، آسمان کو شہادت وگواہی کے طور پر پیش کرنے کے بعد تاریخی واقعات سے اس کو مدلل و مؤکد کیا ہے۔ مثلاً ہواؤں اور بادلوں کا اس طرح گردش کرنا جس میں عام مخلوقات کے لیے نفع اور بعض دوسری مخلوقات کے لیے نقصان وعذاب کا پہلو نمایاں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ہوائیں برے اور بھلے کے درمیان امتیاز اس طرح پیدا کرتی ہیں کہ ایک کے لیے عذاب اور دوسرے کے لیے رحمت

۲۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیں تفسیر سورہ والتین ص ۳۱۴۔۳۱۹۔

بن جاتی ہیں[۲۴]۔

فطرت کے دلائل کو تاریخی واقعات سے تقویت پہنچانے کے اسلوب کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے سورہ شمس کی تفسیر کا مطالعہ بہ طور خاص مفید ہے۔ مولانا کے مطابق سورہ شمس میں پندرہ آیتیں ہیں اور ان سب میں خدا کے قانون جزا و سزا کی شہادت ہے۔ ابتدائی دس آیتیں عام دلائل فطرت میں سے ہیں یعنی شمس وقمر، روز وشب، زمین وآسمان اور نفس وغیرہ اور بقیہ پانچ میں مسلّم تاریخی شہادتیں ہیں اور ان آیات کے باہمی ربط پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخی دلائل کے پہلو بہ پہلو فطری دلائل بیان ہوتے ہیں۔ اس سورہ میں معاد پر ایک تاریخی شہادت کی تفصیل جو آفاقی اور انفسی دونوں طرح کے دلائل کی جامع ہے یوں پہنچائی ہے کہ اہل عرب جن قوموں عاد و ثمود وغیرہ سے اچھی طرح واقف تھے ان ہی کو دلائل تاریخی کے طور پر ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سورہ میں چند مختصر لفظوں میں ثمود کے متعلق جو اشارات کیے گئے ہیں وہ اہل عرب بالخصوص اہل مکہ کے سامنے عاد و ثمود کی پوری تاریخ آئینہ کر دینے کے لیے کافی تھے۔ ان بستیوں کی شہرت انہیں ورثہ میں ملی تھیں اور ان کی مثلیں ان کی روزمرہ گفتگوؤں کا حصہ تھیں۔ شعرا اپنے اشعار میں ان کے معروف اور مطلق العنان سرداروں کا تذکرہ کرتے تھے۔ مولانا فراہی نے دلائل فطرت کو ان تاریخی شواہد سے تقویت پہنچانے کے قرآنی اسلوب کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب تواتر کے ساتھ ان واقعات کو انسان سنتا ہے تو اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان واقعات سے عبرت حاصل کی جائے۔ لکھتے ہیں:

> واقعات کی شہادت چونکہ ہر شخص محسوس کرتا اور ان کی تفصیلات تواتر کے ساتھ سنتا ہے اس وجہ سے قدرتی طور پر طبیعتیں ان سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ اپنے نفس پر خواہشوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے آدمی کو اپنے اعمال کی برائی نظر نہیں آتی۔ لیکن برائی سے نفرت ایک فطری بات ہے۔ اس وجہ سے دوسرے کے حالات سے وہ عبرت حاصل کرتا ہے۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ہمارے اعمال کے مطابق جزا دینے کا جو معاملہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان شہادتوں کے اندر ان کا ہر پہلو موجود ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہمارے اندر نیکی اور بدی کا مخفی الہام فرمایا۔ اس کے بعد جھڑکی اور دھمکی دے کر ہم کو ہوشیار کیا۔ پھر اپنی اس جھڑکی اور دھمکی کے آثار ونتائج یعنی معذب قوموں کی ڈھئی ہوئی بستیوں کو بعد میں آنے والوں کے لیے

۲۴۔ تفسیر سورہ ذاریات ص ۱۰۴۔

سرمایۂ عبرت بنا کر محفوظ کر دیا کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کے اگلوں کے ساتھ ان کی شرارت پر کیا معاملہ ہوا۔ پس ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر آفاقی اور انفسی دونوں طرح کی دلیلیں جمع ہوگئی ہیں۔[25]

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا فراہیؒ نے فطرت کے دلائل کو تاریخی واقعات سے تقویت پہنچانے کے قرآنی اسلوب کو کس قدر دلنشین اور عقلی انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کا مقصد بھی یہ بتا دیا کہ اس پر انسان غور کرے اور اس سے عبرت حاصل کرے۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے بہ قول:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

قانون مؤاخذہ کی تاریخی بحث اور امت میں اس کی مثالیں: مولانا نے اس سورہ میں جہاں قوموں کے مؤاخذہ کے قانون پر گفتگو کی ہے وہاں واضح طور پر لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی نافرمانی پر فوراً گرفت نہیں کرتا۔ اس کے بہت سے گناہوں سے صرف نظر اور توبہ کی مہلت عطا کرتا ہے اور اس کا اس وقت تک مؤاخذہ نہیں کرتا جب تک وہ پورے طور پر عذاب و ہلاکت کے لیے اپنا استحقاق ثابت نہ کر دے۔ چنانچہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کی حکم عدولی اور عدم اطاعت پر بار بار سزا دی لیکن اپنی شریعت اور ان کو اپنے رشتۂ قربت اور نظر عنایت سے اس وقت محروم کیا جب انہوں نے حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو بھی بزعم خود قتل کر کے اپنا پیمانۂ معصیت لبریز کر لیا۔

قوم ثمود نے اونٹنی اور یہود نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے اس کی تقلید کی مثال قائم کی اور یہ دونوں قومیں اللہ کی گرفت سے بچ نہ سکیں۔ مولانا نے اسلامی تاریخ کے چند واقعات کی روشنی میں بعض ایسے فکر انگیز تاریخی نتائج کی جانب اشارے کیے ہیں جن سے اتفاق و عدم اتفاق الگ بات ہے تاہم مولانا کے منفرد انداز تفکر اور عمیق مطالعہ کو نہ تسلیم کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کے دعویٰ کے مطابق ان کے یہ نتائج طبع زاد نہیں بلکہ اس کے اشارات قرآن میں موجود اور نتائج اس سے ماخوذ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اونٹنی اللہ کی نشانی تھی اور قرآن نے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو بھی سورۂ انبیا آیت وجعلنها وابنها اٰية للعالمين میں نشانی کہا ہے۔ یعنی ان کا وجود بھی آیت تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے ارادۂ قتل کے جرم کی پاداش میں ثمود کی طرح یہود بھی پامال کر دیے گئے اور ان سے نبوت کی

۲۵۔ تفسیر سورہ شمس ص ۲۹۱

نعمت ہمیشہ کے لیے چھن گئی [۲۶]۔

مولانا فرماتے ہیں کہ بعینہ اسی کے مشابہ واقعہ امت مرحومہ (مسلمہ) میں بھی پیش آیا۔اس امت کے اندر ناقہ کی مثال حضرت علیؓ تھے۔چنانچہ ان کی شہادت کے بعد اس امت سے خلافت چھن گئی اور خلفا کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ان کے بعد جو لوگ بیٹھے وہ خلیفہ نہ تھے بلکہ ملوک وسلاطین تھے۔(الا ماشاء اللہ)۔آپؐ نے اس دور کو ''ملک عضوض'' [۲۷] سے تعبیر کیا۔حضرت علیؓ کے متعلق آپ کی پیشین گوئی کے حوالہ سے یہ تاریخی واقعہ بھی تحریر کیا ہے کہ جس میں آپؐ نے فرمایا: اے ابوتراب! (علیؓ) کیا میں تمہیں بدبخت ترین خلائق احمر ثمود کی خبر نہ دوں جس نے ناقہ کو قتل کیا اور جو تم کو اس پر (سر پر) مارے گا اور اس سے (داڑھی) تر ہو جائے گی [۲۸]۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ سے پہلے حضرات عمرؓ وعثمانؓ نے بھی جام شہادت نوش کیا۔امت تو ان سے پہلے فتنہ کا شکار ہو گئی تھی تو ان دونوں کی شہادتوں کو مولانا نے مثالاً کیوں نہیں پیش کیا؟۔مولانا فراہیؒ نے اس کا قدرے تفصیلی جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تم کہو گے کہ حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمان غنیؓ نہایت مظلومیت اور بے کسی کی حالت میں قتل ہوئے، جن کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔حضرت فاروق اعظمؓ شہید ہوئے جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔سب سے آخر میں حضرت امام حسینؓ قتل ہوئے جن کی مظلومیت تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔پھر ہم نے ان میں سے کسی کے واقعہ کو حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ سے کیوں نہیں تشبیہ دی؟ اس کے لیے حضرت علیؓ کے واقعہ کو کیوں انتخاب کیا؟۔اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ ایک مخصوص نوعیت رکھتا ہے۔آپ کے قتل کی ذمہ داری اس امت پر نہیں ہے۔آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا۔امت آپ کے قتل کے وبال سے بچ گئی۔قانون الٰہی نے ڈھیل سے کام لیا۔یہ واقعہ حضرت زکریاؑ سے اس طرح مشابہت رکھتا ہے کہ ان کو قربان گاہ اور مسجد کے درمیان قتل کیا گیا اور حضرت عمرؓ بھی نماز کے اندر شہید ہوئے۔حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا حلیہ اور بہت سی صفتیں تورات میں بیان ہوئی ہیں۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ حضرت یحیٰؑ کے مشابہ ہے۔یحیٰؑ قید کی حالت میں اور عثمانؓ مکان کے اندر بند کر کے شہید کیے گئے۔ان وجوہ سے حضرت عیسیٰؑ سے جو مشابہت حضرت علیؓ کے واقعہ کو ہے وہ کسی دوسرے واقعہ کو نہیں ہے۔نتائج کے اعتبار سے دونوں

۲۶۔ماخذ سابق ص ۲۹۸۔

۲۷۔یہ مسند ابن حنبل کی روایت ہے۔روایت میں زمان عضوض کا لفظ وارد ہے۔دیکھیے مسند احمد بن حنبل جلد ۱ ص ۱۱۶۔

۲۸۔تفسیر سورہ شمس ص ۲۹۸

بالکل یکساں اہمیت کے حامل واقعات ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ کا ارادۂ قتل کر کے خدا کی امانت سے اور مسلمان حضرت علیؓ کی شہادت کے ذمہ دار ہو کر خلافت مقدسہ سے محروم ہو گئے۔ حضرت حسینؓ کے قتل کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> باقی رہا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا معاملہ تو یہ ملت مرحومہ کے سینہ کا وہ زخم ہے جو ہمیشہ تازہ رہے گا اور تاریخ کبھی اس کو فراموش نہ کر سکے گی اور درحقیقت یہ اسی بدبختی کا مظہر ہے جو حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں نمودار ہوئی۔[۲۹]

اتنا ہی نہیں کہ مولانا نے امت مرحومہ میں ناقۃ اللہ اور حضرت عیسیٰ کی مثال تلاش کی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم ثمود و یہود مستحق عذاب قرار پائی بلکہ اس واقعہ کی جڑ سے ہزار ہا فتنوں کی شاخیں پھوٹیں اور اس کے زہریلے اور مہیب اثرات وثمرات نہ جانے کن کن شکلوں میں سامنے آئے۔ مولانا نے ان سب کو اسی شجرۂ فساد کا برگ و بار مانا ہے۔ اس واقعہ کے بعد امت جس افتراق وتشتت اور باہمی جنگ وجدل کا شکار ہوئی اس کو قرآن مجید کی سورہ انعام کی آیت ۶۵ اور خطبۂ حجۃ الوداع کے بعض جملوں کی روشنی میں ظہور عذاب سے تعبیر کیا ہے اور بعد کے زمانوں میں بھی اس عذاب کی نحوست کے ظاہر ہونے کے نتائج مستنبط کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ عذاب نمودار ہو گیا۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی جماعتوں میں ایسی خوں ریز جنگیں ہوئیں کہ مسلمان بالکل بے دم ہو کے رہ گئے اور جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت کو چکھا دیا اور یہ آگ برابر مشتعل رہی بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس کے بعد مسلمانوں پر جتنی آفتیں نازل ہوئیں وہ تمام تر اسی قسم کی جماعتوں کے ہاتھوں نازل ہوئیں[۳۰]۔

یہ اور اس طرح کے تاریخی پہلو تفسیر نظام القرآن میں جگہ جگہ موجود ہیں جو مولانا کے تفسیری استنباطات اور اخذ نتائج کے لحاظ سے ان کے تفردات میں شامل ہیں۔ تاہم اس سے قرآن مجید پر ان کے الگ انداز سے غور وفکر کی راہ اختیار کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ایسی راہ جس کا مسافر اگر صحف سماوی، قدیم وجدید عربی زبان وجاہلی ادب اور تاریخ امم کے انقلابات کے گہرے اور دقیق مطالعہ اور فکر تازہ سے محروم ہے تو کامیابی اس کے لیے مشکل ہے۔

۲۹۔ ماخذ سابق ص ۲۹۹۔

۳۰۔ ماخذ سابق ص ۳۰۰۔

یاقوت حموی کی معجم البلدان:
جغرافیائی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا

ڈاکٹر سجاد رشید
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی اونتی پورہ (کشمیر)
sajadrashid77@gmail.com

معجم البلدان یاقوت حموی کا وہ عظیم تصنیفی کارنامہ اور بے مثال خزانہ ہے جس نے یاقوت حموی اور اس کی کتاب کے نام کو پوری دنیا میں روشن کر کے اس کی عظمت اور شہرت کو دوبالا کر دیا۔ اسلام کی آمد سے دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ قرآن شریف میں اگلی امتوں کے حالات و واقعات کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ تحقیق پیدا ہوا اور مسلمانوں نے ایسے ایسے حیرت انگیز کارنامے کئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ ان ہی صف اول کے جغرافیہ دانوں میں یاقوت حموی بھی شامل ہے۔ جس کی مذکورہ بالا تصنیف نے جغرافیائی معلومات کے ساتھ ساتھ کتاب کے مصنف کو بھی ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنا رکھا۔ معجم البلدان علماء و محدثین کرام، شعراء و ادباء اور دانشوروں کی حیات و واقعات اور نقشہ جات پر مشتمل اہم اور ضخیم دستاویز ہے۔ یہ کتاب کئی ہزار صفحات پر مشتمل ایک انمول خزانہ ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے زائد اشخاص کی تاریخ محفوظ ہے۔ مصنف کو اس کتاب کی تکمیل کے لیے بے شمار مقامات کا سفر کرنا پڑا۔ جن میں مرو کے تین سال بھی شامل ہیں۔[۱]

انسان نے جب سے ہوش سنبھالا اور اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کرنے لگا تب سے ہی دو چیزوں نے اُسے متاثر کیا۔ ایک شعر و شاعری اور دوسرا جغرافیہ کا علم۔ یہ دونوں اسی طرح انسان کے لئے لازم و ملزوم ہے جیسے روح اور جسم، یا پھول اور اس کی خوشبو۔ پھول پودے میں لگتا ہے اور پھول کے لئے پودہ اور اس کے لئے زمین کا وہ زرخیز حصہ جہاں پر سبز رنگ کا مخمل بچھونا ہوتا ہے۔ اور

۱۔ www.muslim heritage.com/topics/default
Brills E.J. Encyclopedia of Islam. Laiden, Vol. 11, 2000, pp. 264-266
ماہنامہ دائرۃ المعارف، نمبر۴ جلد ۲۶، ۱۹۳۰ء، ص ۲۵۰-۲۶۰ / دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد ۳۲، ص ۲۶۷-۲۷۰

جب شاعراس پھول اور سبزہ زار کو دیکھتا ہے تو پھول کی خوشبواس کی روح کو معطر کرتی ہے تو اُسے اشعار کہنے پر مجبور کرتی ہے، جس سے ہر ایک سننے والا واہ واہ کے بغیر نہیں رہتا۔ انسان جہاں رہتا ہے اُس جگہ سے بہت محبت کرتا ہے چاہے وہاں کا پانی ہو یا پہاڑ یا درخت۔ انسان وطن کی محبت میں پوری زندگی گذارتا ہے۔ اور وطن کی محبت اور اس کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا ہے۔ اسی لیے بعض ادیبوں نے یہ کہنے سے گریز نہیں کیا کہ وطن اور ادب ایسا موضوع ہے جس کے لیے پوری زندگی بھی داؤ پر لگائی جائے تو وہ بھی کم پڑے گی۔ کیونکہ وطن کی محبت انسان کو بہترین شاعر اور بڑا ادیب بنانے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ شعراء کی فہرست تو بہت لمبی ہے اور اگر جاہلی شعراء کے اشعار کو دیکھا جائے تو شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے اپنے وطن کی خوبصورتی کو بیان نہ کیا ہو۔ معلقہ کا پہلا شعر ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شعر و ادب میں علم جغرافیہ کی کیا اہمیت ہے۔

امراء القیس اپنے قصیدے کے پہلے شعر میں کہتا ہے:

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحوملِ

زمانہ جاہلی یعنی دینِ اسلام سے پہلے عربوں کی جغرافیائی معلومات بعض روایتی اور قدیم جغرافیائی تصورات یا جزیرہ عرب کے مقامات اور آس پاس کے علاقوں کے مقامات کے ناموں تک محدود تھیں۔ یہ معلومات جن تین بنیادی ماخذ میں محفوظ ہیں وہ قرآن شریف، احادیث نبوی اور قدیم عربی شاعری ہیں۔ قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں ان سے اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں جغرافیائی مظاہر کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جغرافیہ و کائنات کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں ان کے علاوہ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دیگر اصحاب سے ایسی روایات بھی موجود ہیں جن کا تعلق کائنات ارض و سماء اور دیگر متعلقہ مسائل سے ہیں۔ یہ روایات جن میں عربوں کے قدیم جغرافیائی تصورات جھلکتے ہیں آہستہ آہستہ جمع ہوئیں اور پھر باضابطہ طور پر لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ سیاحوں نے بھی جو کچھ لکھا اور جو کچھ معلومات فراہم کیں اس کی مثال دینا ناممکن نہیں۔

دین اسلام میں علم جغرافیہ کے فروغ میں عبادات اور معاملات دونوں نے اہم کردار ادا کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات جن میں اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کا ذکر کیا ہے وہ محرکات تھے جنہوں نے مسلمانوں کو جغرافیہ کا علم حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔[۲]

۲۔ دی او بروچیف: ارضیات کے بنیادی تصورات، مترجم ڈاکٹر ماجد حسین، ترقی اردو بورڈ، نیو دہلی، لون ڈاکٹر قادر، قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، ص ۲۷

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

۱۔ام من جعل الارض قرارا و جعل خلالها انهارا۔ (النحل)

۲۔ الم نجعل الارض مهادا و الجبال اوتادا۔ (النساء)

۳۔والله جعل لكم الارض فراشا والسماء بناء۔ (البقرة)

۴۔ والذی جعل لكم الارض مهدا۔ (الزخرف)

جُوغرافیہ یا جغرافیہ کی اصطلاح جو مارنیوس الصدری Marinos of Tyre اور بطلیموس Claudius Ptolemy کی تصنیفات کے عنوان کے طور پر استعمال ہوئی ہے، اس کا عربی ترجمہ صورۃ الارض کیا گیا۔ چنانچہ بعض عرب جغرافیہ نگاروں نے اپنی تصنیفات کا یہ عنوان رکھا۔ المسعودی نے اسی اصطلاح کی تشریح ''قطع الارض'' سے کی جس کا معنیٰ ''زمین کی مساحت و پیمائش'' ہے۔[۳]

نام ونسب: یاقوت حموی کا پورا نام شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت بن عبداللہ رومی، حموی، بغدادی ہے[۴]۔

اہل عرب کے یہاں یہ بات عام تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو عمدہ پتھروں کے ناموں سے پکارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عسکر بن ابوناصر جس نے یاقوت کو خریدا تھا اس کا نام یاقوت رکھا۔ اسی طرح اپنے آقا کی نسبت کے طور پر وہ حموی بھی کہلائے۔ چونکہ یاقوت کے آباء واجداد کا تعلق ملک روم سے تھا اس لیے ان کو رومی بھی کہا جاتا ہے۔[۵]

یاقوت حموی کی ولادت تُرکی کے ایک عظیم شہر استنبول میں ۵۷۵ھ/ ۱۱۷۹ء میں ہوئی۔[۶]

Yaqut-al-Hamani, the famous Arab encyclopediest , born in 575 (1179) in ByzantineTerritory

یاقوت حموی پانچ یا چھ برس کی عمر میں اسیر ہوکر بغداد کے ایک تاجر عسکر بن نصر بن ابراہیم حموی کے ہاتھ لگا۔ عسکر ناخواندہ تھا۔ اور اُس کو اس بات کا احساس تھا اور افسوس بھی کہ وہ علم حاصل کرنے سے رہ گیا۔ مگر اُس نے دل میں یہ ارادہ کیا تھا کہ یاقوت کو وہ علم حاصل کرنے میں آزاد رکھے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یاقوت نے مکتب میں داخلہ لیا اور سالم بن احمد سے شرف تلمذ لیا۔ آہستہ آہستہ وقت گذرنے کے

۳۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، جلد۷، سنہ ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۹

۴۔ یاقوت حموی، معجم البلدان، جلد اص ا، ماہنامہ دائرۃ المعارف، نمبر۴، جلد ۲۶، جولائی ۱۹۳۰ء، ص ۲۶۷-۲۶۸

۵۔ یاقوت حموی، معجم البلدان، جلد۷، ص ۳۰۰ / یاقوت حموی، معجم البلدان، تحقیق فرید عبدالعزیز، جلد اص ۴-۵

۶۔ ماہنامہ دائرۃ المعارف، ص ۲۶۲، الحنبلی ابن عماد، شذرات الذہب، جلد ۵، ص ۱۲۱ Brills E.J. Encyclopedia of Islam Vol: 11, 2002, p 264

ساتھ ساتھ نحو اور لغت مبارک بن مبارک جو اُس زمانے کے مشہور استاد تھے سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آقا کے مقصد کے حصول کے لیے یاقوت کو دور دراز ملکوں کا تجارتی سفر کرنا پڑا۔[۷]

تجارتی قالین، غالیچہ اور نقاب وغیرہ کو لے کر یاقوت کیش اور عمان ہوتے ہوئے شام کا سفر کیا۔ واضح رہے کہ مذکورہ شہران دنوں تجارت کے اہم مراکز تھے جہاں عربوں اور غیر عربوں کا گذر ہوتا تھا۔ یاقوت کی تجارتی سرگرمیاں کافی عرصہ تک انہی شہروں سے وابستہ رہیں۔ کاروباری مصروفیات کے باوجود یاقوت نے علم و ادب کا ذوق زندہ رکھا۔ تجارت میں کچھ وقت دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت کتب خانوں میں صرف کرتا تھا۔ اس کے لیے اُس نے ادب و نحو کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور مشہور علماء سے سند فضیلت بھی پائی اور بہت سے شعراء کے ساتھ ملاقات بھی کی جن کا ذکر اُس کی تصانیف میں جا بجا ملتا ہے۔ اسی دوران یاقوت اور اس کے مالک کے درمیان کسی بات پر اَن بَن ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آقا نے سنہ ۵۹۶ھ میں اس کو آزاد کر کے خود سے الگ کر دیا۔[۸]

اس علحدگی کے بعد یاقوت نے کتابت کو ذریعہ معاش بنایا تحصیل علم کے لیے کتابت کا یہ ذریعہ معاش بہت فائدہ مند ثابت ہوا اور سات سال کی مدت میں یاقوت نے ۳۰۰ کتابوں کی کتابت کی۔ یہ سلسلہ اور طویل ہوتا لیکن عسکر نے ایک بار پھر اس کو اپنا بنایا اور کچھ تجارتی سامان کے ساتھ کیش روانہ کیا۔[۹]

کیش جانے کے بعد تجارتی مصروفیت کے ساتھ ساتھ حصول علم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جس کا ذکر اس نے ''بین السورین'' میں اس طرح کیا۔ ''کرخ بغداد کے ایک آباد محلے کا نام ہے جس میں بہاء الدین عز الدولہ کے وزیر ابونصر سابور بن ازدشیر کا وقف کردہ عظیم کتب خانہ تھا جس سے بہتر کتابیں دنیا کے کسی کتب خانے میں نہ تھیں۔ کیونکہ یہ معتبر ائمہ کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مسوّدے تھے۔ سلجوقیوں کے فرماں روا طغرل بک نے سنہ ۴۴۷ھ میں بغداد میں جو تباہی مچائی اس میں بہت سے محلے جل کر راکھ ہوگئے اور اسی میں یہ عظیم سرمایہ بھی جل کر خاکستر ہوگیا۔[۱۰] تجارتی سفر کے بعد جب یاقوت واپس آیا تو اس کا آقا عسکر، مر چکا تھا۔[۱۱]

۷۔ الحنبلی ابن عماد، شذرات الذہب، جلد ۵ ص ۱۲۱

۸۔ یاقوت حموی، معجم البلدان تحقیق فرید العزیز، ج ۱ ص ۱-۵ Brills E.J. Encyclopedia of Islam Vol. 11, 2002, p 264

۹۔ الجبوری کامل سلیمان، معجم الشعراء، ج ۶ ص ۱۲۵، الجبوری کامل سلیمان، معجم الادباء، ج ۷، ص ۷، کحالہ عمر رضا، معجم المؤلفین ج ۱۳، ص ۱۷۹

۱۰۔ یاقوت حموی، معجم البلدان، ج ۱، ص ۴-۵

۱۱۔ ماہنامہ معارف نمبر ۴ ج ۲۶، ص ۲۵۴

یاقوت نے ایمانداری کے ساتھ اپنے آقا کے وارثوں کا حق ادا کیا۔ اور باقی مال جو اس کے پاس بچ گیا اُسے اُس نے تجارت میں لگا دیا۔ اور بالآخر کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا۔ یاقوت حموی نے خوارج کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا جس کے اثر سے وہ حضرت علیؓ کا مخالف ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب اس نے ۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء میں دمشق کا سفر کیا تو وہاں حامیانِ علیؓ سے مناظرہ بھی کیا۔ دورانِ مناظرہ حضرت علیؓ کی شان میں اس نے کچھ گستاخی کی جس سے وہاں کے لوگ مشتعل ہوگئے۔ مناظرہ کی پوری روداد حاکم شہر کو معلوم ہوئی تو اُس نے یاقوت کو طلب کیا اور اُسے گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن وہ کسی طرح دمشق سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ دمشق کا یہ دوسرا سفر کافی مہنگا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے سنہ ۶۰۳ھ میں یاقوت یہاں کا سفر کر چکا تھا اور اسی دوران اُس نے تاج الدین الکندی (متوفی ۳۱۶ھ اور عبدالصمد الخرستانی متوفی ۴۱۶ھ سے فیض حاصل کیا تھا۔[۱۲]

۶۱۰ھ میں اس کا گذر تبریز سے ہوا جہاں اُس نے مفید عبدالخالق المسکی (متوفی ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء) سے نحو کے علاوہ المقدسی کی انتظار پڑھی۔ وہ مصر سے موصل اور موصل سے اربل اور پھر آرمینیا، اُس کے بعد تبریز، مشرقی ایران، خراسان اور مرو کا سفر کرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یاقوت نے اس سفر میں دو سال گذارے۔[۱۳]

اسی سفر میں مالی مشکلات کی وجہ سے یاقوت کو اپنی خوبصورت اور نیک سیرت باندی کو چھوڑنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ نیشاپور کو بھی الوداع کہنا پڑا۔ سرخش سے خراسان پہنچ کر اس نے دم لیا اور پھر سے تجارت سفر شروع کی۔ اور تین سال تک مرو میں قیام کیا۔ مرو کے متعلق یاقوت حموی لکھتا ہے کہ اگر ان ملکوں میں تاتاریوں کی غارتگری کا سلسلہ شروع نہ ہوا ہوتا تو میں وہاں پر مرتے دم تک رہتا اور اس خوبصورت وطن کو نہ چھوڑتا۔ کیونکہ اس شہر کے باشندوں میں فیاضی، نرمی اور حسن معاشرت پائی جاتی ہے۔ اور وہاں پر کثرت سے امہات الکتب موجود ہیں۔ میں نے جب اس شہر کو چھوڑا تو اُس وقت اس میں دس کتب خانے وقف عام تھے اور اس میں جو کتابوں تھیں وہ اور کہیں دنیا میں موجود نہ تھیں۔ غزیریہ اور کمالیہ کے کتب خانے جامع مسجد میں تھے۔ جس کو عزالدین ابوبکر الریحانی یا عتیق بن ابوبکر نے وقف

۱۲۔ www. Bookrags.com/biography-yaqut.

۱۳۔ الجبوری کامل سلیمان، معجم الادباء، ج ۷، ص ۷/ الجبوری کامل سلیمان، معجم الشعراء، ج ۶ ص ۱۲۵

Brills E.J, Encyclopedia of Islam, Vol.11 year 2002, P. 265. " Which he bought a very beautiful Turkish slave of whom he was enamored."

کیا تھا۔ ان کتب خانے میں تقریباً بارہ ہزار کتابیں تھیں۔ ایک اور کتب خانہ جس کا نام شرف الملک تھا جس کو ابوسعید محمد ابن المنصور ۴۹۴ھ نے قائم کیا تھا۔ نظام الملک محمد بن اسحاق کا کتب خانہ بھی اسی جگہ تھا۔ دو کتب خانے سمعانین کے تھے اور ایک مدرسہ عمدیہ میں تھا۔ نیز مجدُ الملک کا بھی ایک کتب خانہ تھا جو متاخرین وزراء میں سے تھا۔ کتب خانہ خاتونیہ بھی اسی میں تھا۔ کتب خانہ ضمیریہ وہاں کی ایک خانقاہ میں تھا جس سے نہایت آسانی کے ساتھ کتابیں پڑھنے کے لئے مل جایا کرتی تھیں۔ اس نے لکھا کہ خود میرے مکان میں دوسو کتابیں تھیں جن میں اکثر بغیر رہن کی تھیں۔ حالانکہ ان کی قیمت دوسو دینار تھی۔ مرو میں یاقوت نے اپنا اکثر وقت پڑھنے، معلومات حاصل کرنے اور مسوّدے تیار کرنے میں گذارا۔ اگرچہ اہل علم نے بشمول جاحظ یہاں کے باشندوں کو بخیل قرار دیا ہے تاہم یاقوت کا تجربہ یہاں برعکس رہا۔ رمضان المبارک ۶۱۲ھ/۱۲۱۹ء میں یاقوت دریائے جیجون کو پار کرکے سیدھے خوارزم پہنچا۔ اس سفر کے شدائد کا ذکر اُس نے اپنی کتابوں میں جابجا کیا ہے۔ لیکن خوارزم پہنچ کر اس کی شوریدہ بختی رنگ لائی اور ۶۱۶ھ میں تاتاری غارت گری شروع ہوئی اور تباہی مچی۔ [۱۴]

اس کے بعد یاقوت وہاں سے موصل پہنچ گیا۔ یاقوت حموی نے ۶۱۵۔۶۱۶ھ/۱۲۱۸ء/۱۲۱۹ء میں معجم البلدان لکھنے کا قصد کیا۔ تاہم سیاسی حالات خراب ہونے کے باعث وہ اس کام پر مکمل توجہ نہ دے سکا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پھر سفر کا ارادہ کیا اور کچھ ملکوں کا سفر بھی کیا۔ حلب کے وزیر جمال الدین ابوالحسن بن یوسف ابراہیم بن الواحد الشیبانی القفطی جو یاقوت سے ۶۰۹ھ میں ملا تھا کو یاقوت سے بڑی ارادت تھی۔

اسی القفطی کی مدد لطف و کرم سے یاقوت نے معجم البلدان مکمل کی۔ اس نے اپنا آخری سفر حلب سے ایران، موصل اور مصر کا کیا اور پھر دوبارہ حلب میں مقیم ہوا جہاں القفطی کے زیر سایہ تادمِ حیات یعنی ۱۲۲۹ء تک رہا۔ [۱۵]

یاقوت نے مرنے سے پہلے اپنی تمام کتابیں ابوالحسن بن الیزیدی ۵۷۵ھ/۱۱۸۰ء کی مسجد یا مشہد کو وقف کردی تھیں اور مشہور مورخ شیخ عزالدین ابوالحسن ابن الاثیر نے اس وصیت کو نافذ کیا تھا۔ [۱۶]

۱۴۔ www.advantour.com/Uzbekistan/history.html

۱۵۔ Brill, E.J. Encyclopedia of Islam Vol. 11. 2002 P.267
H/1220AD....618....Ibn Kifti whom he met on 609/1212 and whom he wrote a letter from Mousil in 617 com. to pics. default. www.Muslim heritage.

۱۶۔ کحالہ عمر رضا، معجم المؤلفین، ج ۱۳، ص ۱۷۹/ دائرۃ المعارف اسلامیہ، ج ۲۳، ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۸

یاقوت حموی کی تصانیف: ۱ . معجم الادباء . ۲. المشترک وضعا و المفترق /المختلف صقعا.۳. مراصد الاطلاع .۴. اخبار اَھل الملک و قصص اھل النحل فی مقالات اھل الاسلام.۵. الرد علی ابن حسینی.۶. کتاب اخبار الشعراء .۷. اوزان الاسماء و الافعال الحاسر الکلام الوب.۸. المبدا و المال فی التاریخ.۹. کتاب الدول.۱۰. معجم الشوارد.۱۱. کتاب الاَغانی ۱۲. المقتضب فی النسب.۱۳. مجموع الکلام ابن/ ابی علی الفارسی.۱۴. معجم الشعراء ۱۵. معجم الشعراء اور اخبار شعراء.۱۶. اخبار الاُدباء.۱۷ کتاب الوزراء.۱۸. سیر شھاب الدین الغوری.۱۹. نھای العجب.۲۰. کتاب من له حمة.۲۱. الشعراء المتاخرین القدماء.

معجم البلدان میں ادبی شخصیات کا تذکرہ بھی ہے لیکن یہ کتاب جغرافیائی معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ بھی ہے۔عباسی دور میں ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے تو ثابت بن قرۃ نے یونانی جغرافیہ دان بطلیموس کی کتاب ''Geographical Treatise'' کو عربی کا جامہ پہنایا۔اس کے علاوہ افلاطون کی تصنیفات ''طیماؤس''، ''الآثار العلوی''، ''اسماء ماالعلم'' اور ارسطو کی کتاب ''مابعدالطبیعیات'' کا بھی ترجمہ کیا گیا۔خلیفہ مامون رشید ۱۹۷۔۲۱۰ھ/۸۱۳/۸۳۳ء کے عہد خلافت میں مشہور مسلم ریاضی دان محمد بن موسیٰ خوارزمی متوفی ۲۳۲ھ/ ۸۴۶ء نے جغرافیہ کے موضوع پر ''صورت الارض'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا یہ نقشہ خوارزمی سمیت ستر (۷۰) ماہرین نے تیار کیا تھا۔ اس کے بعد ابن خرازینہ متوفی ۳۰۰/۹۱۳ء نے ایک کتاب ''المسالک والمما لک'' لکھی۔خرازینہ کو ہی مسلم جغرافیہ دانوں کا بابائے آدم کہا جاتا ہے۔انہوں نے یہ کتاب خلیفہ ہارون رشید کے حکم پر لکھی۔ خلیفہ ہارون رشید کی کاوشوں سے ہی بیت الحکمت کی بنیاد پڑی، جو اسلامی دنیا کا پہلا دارالترجمہ تھا۔ [۱۷]

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جغرافیہ پر بہترین کتابیں لکھی گئیں۔جن میں تیسری صدی ہجری میں احمد بن یعقوبی کی کتاب ''کتاب البلدان''، ابن رستہ متوفی ۹۲۲ء کی ''الاعلاق النفیسہ'' اور ابن الفقھیہ ہمدانی کی ''کتاب البلدان'' قابل ذکر ہیں۔اور چوتھی صدی ہجری میں جغرافیہ پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں قدامہ بن جعفر متوفی ۹۲۲ء کی کتاب ''کتاب الخراج وصنعۃ الکتاب'' جس میں راستوں، ڈاک کی منزلوں کے علاوہ سرحدوں کی تفصیل بھی تھی ۔ابوالحسن علی بن حسن مسعودی کی کتاب ''القضایا والتجارب''، ابوزید احمد بن سہل بلخی متوفی ۳۲۲ھ کی ''دبستان بلخ''، ابواسحاق ابراہیم بن محمد فارسی اصطخری کی ''الملک والمما لک''، جس میں ہر ایک ملک کو رنگین نقشے میں دکھایا گیا تھا۔اصطخری کی درخواست پر

۱۷۔لون ڈاکٹر قادر: قرون وسطی میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، ص ۲۷، رقدوائی محمد ہاشم: یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین، ترقی اردو بورڈ ۔ Brills E.J. First encyclopedia of Islam, Vol:4, year 1987, P.913 , Masudul Hassan: History of Islam, Vol:1 P. 640

ابوالقاسم محمد بن حوقل بغدادی متوفی ۳٦۷ھ/ ۹۷۷ء نے ان نقشوں پر نظرِ ثانی کی اور ''صورۃ الارض'' کے عنوان سے ایک کتاب ۹۷۷ء میں قلمبند کی۔[۱۸]

ادریسی کے بعد جو عظیم جغرافیہ داں پیدا ہوا، وہ یاقوت حموی تھا، وہ ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت کا حامل تھا جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس نے محیر العقول تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ ''معجم البلدان'' کے متعلق Encyclopaedia of Islam میں لکھا گیا ہے۔

The dictionary containing not only geographical information but also under each places names astrological and historical data. Quotations from poems and a list of eminent natives of the place. This mixture of his history and geography which is by no means peculiar to yaqut. [19]

معجم البلدان اس عہد کے تمام جغرافیائی معلومات پر مشتمل ہونے کے علاوہ تاریخ علم الاقوام اور فطری علوم کے متعلق قابل قدر مواد فراہم کرتی ہے۔

The majam-al-Buldan is one of the most works of Arabic Literature. It is a store house of information. [20]

یاقوت حموی پہلا جغرافیہ نگار ہے جس نے اس قسم کی کتاب لکھی۔

A geographical dictionary or gazetter, the first of its kind, was completed by Abdullah Yaqut. [21]

معجم البلدان کا یہ محض سرسری جائزہ ہے۔ یہ قاموسی کتاب ساتویں صدی ہجری میں شہروں، پہاڑوں، وادیوں، قصبوں، دریاؤں، سرچشموں، تالابوں، عبادتگاہوں کے ناموں کی تلاش اور ان کی جغرافیائی ترتیب، یاقوت حموی کی عبقریت اور غیر معمولی علم ومطالعہ کے نتیجہ میں سامنے آئی، یاقوت کو اس کی اہمیت کا پورا احساس تھا، اسی لیے انہوں نے شروع ہی میں ظاہر کردیا کہ یہ کتاب محض لہوولعب یا کسی مشغلۂ بےکاری کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ کار واجب تھا اور یہ وجوب خود قرآن مجید کی اس آیت سے لازم ہوا کہ اَفَلَمْ یَسِیْرُوا فِی الْاَرضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا۔ یہی نہیں یاقوت نے بستیوں اور آثار قدیمہ والی مشہور آبادیوں کے علم کے لیے اور دوسروں تک ان کے بارے میں معلومات دینے کے لیے، احادیث نبویہ اور اقوال انبیاء اور کلام شعراء کے ذریعہ اس علم کی اہمیت کو واضح کیا اور وجہ جواز میں لکھا کہ ''فوجب لذلك علينا اعلام المسلمين بما علمناه وارفادهم بما افادنا ه الله بفضله فاتقناه''۔ اس مضمون سے ہم کو بھی یہی اعلام وافادہ مقصود ہے۔

۱۸۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد۷، ۱۹۷۱ء، ص ۲۸۰۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان (عربی) ج ۱ ص ۱۲۹، لون ڈاکٹر قادر: قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، ص ۲۸-۳۳ Singh, N.K. Encyclopedia of Histography of the Muslim world, vol: 2 global vision public house, p. 382

۱۹۔ Brills E.J. First encyclopedia of Islam. Laiden, Vol. 8, 1987, P. 1153

۲۰۔ www.encyclopedia.com

۲۱۔ New standard encyclopedia, statndard educational corp. Chicago, 1930, Vol. 6,p.2225

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی
اورتحریک ندوۃ العلماء: ایک جائزہ

پروفیسر محمد قطب الدین
سینٹر آف عربک اینڈ آفریکن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔
basmaqutb@gmail.com

اکبر الہ آبادی (م: ۱۹۲۱ء) نے ۱۸۹۸ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (م: ۱۱/اگست ۱۹۵۰ء) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا: ''ڈیر خان صاحب! ندوۃ العلماء چمن ہے تو آپ اس کے پھول ہیں، اور اگر زیادہ بامعنی ہونا چاہیں تو آپ اس کے بلبل ہیں....''[1]

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ کا نام ان مخلصین علماء اور عمائدین قوم وملت میں شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے نہ صرف تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد اور اس کی ضرورت سے اتفاق کیا بلکہ اس تحریک کو پروان چڑھانے اور اسے ایک مفید و پائے دار ادارہ بنانے میں بھرپور علمی و انتظامی اور مالی تعاون بھی کیا۔ آپ ابتدا سے اس عظیم تحریک کے رکنِ اساسی تھے اور تادمِ حیات مجلس انتظامی کے اہم رکن رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کا اپنی جامع شخصیت، آفاقی فکر اور ہمہ گیر ثقافت کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء سے متفق ہونا اور اس کا پر جوش حامی بننا لازمی تھا۔ وہ خود بھی جدید وقدیم کے جامع تھے اور تحریکِ ندوۃ العلماء کی بنیاد بھی 'الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع' اور 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر تھی۔

لہٰذا تحریکِ ندوۃ کے اغراض و مقاصد میں خواہ علمی وفکری اعتبار سے جدید و قدیم کے درمیان اعتدال کا راستہ اپنانا ہو یا عربی اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور ضروری حذف واضافہ، یہ تمام اُمور ایسے تھے جو مولانا موصوف کے افکار وخیالات اور ذوق ومزاج سے پوری طرح میل کھاتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس تحریک کو اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سے

۱۔ صدر یار جنگ، مولانا شمس تبریز خان، مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۳۴۱

ان کا رشتہ گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ جس کا اندازہ ہم ان کی تحریروں، تقریروں اور انتظامی سرگرمیوں سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

طرزِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی اصلاح اور ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے اجلاس لکھنؤ کے اپنے صدارتی خطبے میں مولانا شروانی یوں اشارہ کرتے ہیں:

......ضروری ہے کہ طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم دونوں میں اصلاحِ کامل ہو جس سے معاملہ فہم، معاملاتِ عالم سے باخبر علماء پیدا ہوں جو عملی زندگی میں داخل ہو کر اپنی قوتِ فہم و فراست اور معاملہ دانی کا سکہ اہل معاملہ اور کاروباری دنیا کے دلوں پر بٹھا دیں۔ جب یہ سکہ چلے تو ہدایت و رہنمائی اس کا نشان ہو اور دین کا بول عالم میں بالا ہو جائے... ندوۃ العلماء نے نصابِ تعلیم کی اصلاح سے یہی مقصد پیش نظر رکھا تھا۔ اس کے ابتدائے عہد کی تحریریں پڑھیے، میرے بیان کی شہادت ملے گی.... دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تربیت کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے اپنی تعلیم میں علم آموزی و ذوق علمی کا اہتمام، کتاب آموزی سے زیادہ کیا ہے، تربیت میں حوصلہ اور بلند نظری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے.....۲

مولانا شروانی اپنی علمی صلاحیت و قابلیت کے ذریعے تحریک ندوہ کی تشہیر و ترویج میں پیش پیش ہونے کے ساتھ ساتھ مالی تعاون کی بھی فکر کرتے رہے جو اس جامع تحریک کی نشو و نما اور اس کی بقا کے لیے ضروری تھا۔ مولانا کی ان کوششوں اور سخاوت و فیاضی کا اعتراف کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے ناظمِ اول مولانا سید محمد علی مونگیریؒ رودادِ ندوۃ العلماء سالِ دوم میں لکھتے ہیں:

آپ نے ابتدا میں جو ایک نازک وقت تھا، مالی امداد بھی کرائی اور آخر میں جلسۂ انتظامیہ کی خط و کتابت جو آپ کے سپرد کی گئی تھی اسے آپ نے نہایت توجہ اور جوش کے ساتھ انجام دیا اور اپنے ذاتی صَرف سے رؤسا سے خط و کتابت کر کے ان کو اس طرف متوجہ کیا۔ آپ کی توجہ اور ذاتی تحریک کا کہاں تک اثر نہ ہوتا۔[۳]

تحریک ندوۃ العلماء کے لیے ایک دارالعلوم کی ضرورت و اہمیت تمام اراکین و منتظمین نے سمجھی، کچھ بہی خواہ حضرات نے دارالعلوم کا مقام دہلی پیش کیا تو دوسروں نے لکھنؤ۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کی رائے میں لکھنؤ اس کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ بالآخر مولانا شروانی کی تحریک

۲۔ خطبۂ صدارت، اجلاس ندوہ، ۱۹۲۵ء، ص۱۳-۱۸ منقول از: صدر یار جنگ، ص۱۴۴-۱۴۵

۳۔ ماخذ سابق، ص۱۴۵

پر تمام اراکین نے اتفاق کیا اور دارالعلوم کا قیام لکھنؤ میں عمل میں آیا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ندوۃ العلماء کے اکثر اجلاسِ عام میں شریک ہوئے اور آپ نے صدارت بھی کی۔ ان جلسوں میں آپ کے ذریعے پیش کیے گئے مضامین اور مقالے کی سحر انگیزی سامعین پر تادیر باقی رہتی اور نہایت موثر و محرک ثابت ہوتی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب نومبر ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا ساتواں اجلاس بمقام پٹنہ منعقد ہوا اور مولانا شروانی نے اپنا مضمون بعنوان: ''ندوۃ العلما اور اس کی ضرورت'' پیش کیا تو سامعین نے بڑی دل چسپی سے سنا اور بعض موقعوں پر جملوں کو مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔''[۴]

آپؒ ندوۃ العلماء کے مقاصد میں رفع نزاع باہمی اور اصلاحِ نصاب کی ضرورت سے پوری طرح متفق تھے اور اس جامع نصابِ تعلیم و نظامِ تدریس کے ذریعے ایسے علماء پیدا کرنا چاہتے تھے جو زمانہ کے نبض شناس ہوں اور مشرقی و مغربی دونوں علوم کے جامع ہوں تاکہ تغیر پذیر زمانہ میں اپنی ذمے داری ادا کر سکیں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں ندوہ کے 'نویں اجلاس بہ مقام امرتسر' مولانا شروانی نے ''مسلمانانِ ہند کی ضروریات'' کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

> مغربی شائستگی حاصل کرنے، دنیوی مناصب و سربلندی کا اہل بننے اور ہمسایہ قوموں کا ترقی میں مقابلہ کرنے کے واسطے مغربی تعلیم و تربیت کا حاصل کرنا لازم ہے...ہمارا مروجہ عربی نصاب اس نقص کا بہت کچھ ذمے دار ہے۔ وہ علماء کی ان ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا، جو تغیر زمانہ سے پیدا ہوگئی ہیں، وہ ان کی خدمات کو پورا کرنے میں معین نہیں ہوسکتا جو زمانۂ حال میں ان کے ذمہ ہیں۔[۵]

انگریزی تعلیم کو مولانا شروانی نے قومی ضرورت سے تعبیر کیا مگر اسے حاصل کرنے میں توازن پر زور دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: ''میرا مطلب صرف یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو ترقی دینا اس زمانے کی ضروریاتِ قومی میں سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم انگریزی کے رَو میں مسلمان اپنا دین اور مذہب نہ کھو بیٹھیں بلکہ مسلمان رہ کر مغربی تعلیم و شائستگی میں ترقی کریں۔''[۶]

۲۲رویں اجلاس نومبر ۱۹۲۷ء بہ مقام امرتسر کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا شروانی نے قوم

۴۔ ماخذ سابق، ص ۱۴۹

۵۔ ماخذ سابق، ص ۱۵۰

۶۔ روداد جلسۂ نہم، ص ۴۸-۶۸۔ بحوالہ: صدر یار جنگ، ص ۱۵۰

کی توجہ ندوۃ العلماء کی جانب مبذول کراتے ہوئے عربی زبان وادب کی تعلیم پر زور دیا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے یوں فرمایا: ''ایمان کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی آیات سنتے ہی دیوانہ وار ان کی تعمیل پر آمادہ ہوجائیں۔ لیکن یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ سیلاب یورپ آرہا ہے، لہٰذا توحید، رسالت، تمدن اور معاشرت کو چھوڑ کر اسی سیلاب میں کود پڑو، اس تلاطم کا رخ صرف ہماری جانب نہیں تھا۔ بلکہ ہندوؤں کی طرف بھی تھا۔ انھوں نے اس سیلاب کے وقت اپنے چوکے تک کو نہیں چھوڑا، انھوں نے گائے اور گوبر تک کی نسبت اپنے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ انھوں نے اس سیلاب کے وقت کیا تو یہ کیا کہ وہ سنسکرت جیسی مردہ زبان سے چمٹ گئے۔ لیکن ہمارا طریق یہ ہے کہ ہم کو عربی سے کوئی الفت نہیں رہی۔ حالاں کہ وہ ایک زندہ زبان ہے اور ہمارے مذہب و تاریخ، ہماری روایات، ہمارے ادب و تمدن کے خزائن عربی زبان میں ہیں۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آج ایسے تعلیم یافتہ بھی ہم میں موجود ہیں جن کو خیر سے کلمہ کا ترجمہ تو درکنار کلمہ کا صحیح تلفظ بھی نہیں آتا، وہ اسلام سے اتنے کورے ہیں کہ العیاذ باللہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔ خدارا بتاؤ! انصاف کی بات کہو، ہم ایسے تعلیم یافتہ اشخاص پر بحیثیت مسلمان کیا فخر کرسکتے ہیں جو بیسوں ڈگری کے حامل ہوں مگر کلمہ تک صحیح نہ پڑھ سکتے ہیں۔''[۷]

مولانا شروانی چاہتے تھے کہ ندوۃ العلماء اور اس کے فارغین اپنی تمام علمی و تحقیقی ترقیوں کے ساتھ ساتھ شریعتِ اسلامی اور اسلامی اصولوں کے پابند رہیں۔ چنانچہ اخیر زمانہ کی اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا: ''ندوہ میں اگر اسلامی اصول سے ہٹ کر ہزار لڑکے بھی زیرِ تعلیم ہوں تو وہ میرے نزدیک ناکام اور بند ہے، لیکن اگر اصول کے مطابق اس میں تالا لگا ہو تو وہ میرے نزدیک کامیاب اور کھلا ہوا ہے۔''[۸]

تحریکِ ندوۃ العلماء کو مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، خواہ ندوۃ العلماء کی نشو ونما اور ابتدائی مراحل میں ملک بھر میں اس کے تعارف و اشتہار کی کوششیں ہوں یا ندوۃ العلماء کے جلسے، وہ ہر جگہ جلوہ افروز ہوتے اور اپنی مقناطیسی شخصیت کے ساتھ ان کی رونق بڑھاتے۔ ندوہ سے مولانا شروانی کے گہرے اور مخلصانہ تعلق کی بنا پر بارہا انھیں مستقل ناظم بنانے کی تجویز پیش ہوئیں مگر ہر بار انھوں نے انکار کیا، البتہ اس ادارہ کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں و فکرمند رہے۔ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

علامہ شبلی کے بعد علمی و عملی جامعیت، سلامت روی، طبیعت کے سلجھاؤ اور ندوہ کے مقاصد

۷۔ صدر یار جنگ، مولانا شمس تبریز خان، مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۷

۸۔ ماخذ سابق، ص ۱۵۹

سے ذہنی ہم آہنگی کے اعتبار سے دو اور شخصیتوں پر نظر پڑتی تھی، ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، دوسرے مولانا سید عبدالحی صاحب۔ یہ دونوں شروع سے ندوہ کی تحریک میں شریک اور اس کے کاموں میں پیش پیش تھے اور ان کی جامعیت کا دوسرا آدمی دور دور نظر نہیں آتا تھا، لیکن مولانا شروانی ایک خاندانی رئیس، ایک بڑے جاگیر دار اور لکھنؤ سے دور ضلع علی گڑھ میں رہتے تھے۔ ان کا یہی بڑا ایثار تھا کہ وہ ندوہ کی مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اس کے لیے دور دور کا سفر کرتے تھے، اس کے مفوضہ کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، لیکن وہ اس کی نظامت کا عہدہ سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھے اور اپنی ریاست کا انتظام اور حبیب گنج کا قیام چھوڑ کر لکھنؤ میں قیام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔[9]

علامہ شبلی کے ساتھ رسالہ ''الندوہ'' کی ادارت میں مولانا شروانی کی شرکت بھی ندوہ سے ان کی محبت و لگاؤ اور خیر خواہی کی اعلیٰ مثال ہے کیوں کہ ندوۃ العلماء کی تاریخ میں وہ ایک نازک موڑ تھا جب ۱۹۰۴ء میں رسالہ ''الندوہ'' کا اجرا عمل میں آیا اور علامہ شبلی نعمانی اور مولانا شروانی نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس میں شائع اپنے معیاری علمی و ادبی مقالات کی وجہ سے مولانا شروانی علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تحریکِ ندوہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا شروانی کی مشترک ادارت میں اس رسالہ نے بہت جلد علمائے امت کے اندر برسہا برس سے پائے جانے والے جمود کو توڑ ڈالا۔ اس رسالہ نے فرسودہ موضوعات کی جگہ نت نئے موضوعات اور جدید مباحث کو موضوعِ سخن بنایا۔ اس نے اہل علم اور اہل قلم کے افکار و خیالات میں انقلاب برپا کردیا۔ اس طرح یہ رسالہ بہ نظرِ تحسین دیکھا جانے لگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باکمال قلم کاروں کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء کا یہ ترجمان نئی نسل کے لیے مقالہ نویسی، تصنیف و تالیف، زبان و بیان اور طرز نگارش کا ایسی تجربہ گاہ ثابت ہوا، جہاں کی مشق نے انھیں اپنے زمانہ کا نامور مصنف اور قلم کار بنادیا، جس سے قوم و ملت کا بڑا فائدہ ہوا اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ: ''الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُرشور ہے۔''[10]

۹۔ ماخذ سابق، ص ۱۶۰

۱۰۔ علامہ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء، ص ۴۴۳

اسی طرح مکاتیب شبلی میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام علامہ شبلی کے خطوط کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا شروانی کس قدر ندوۃ العلماء کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی ندوہ کے حالات سے مولانا شروانی کو باخبر کرتے رہے اوراس کے انتظام وانصرام ونصابِ تعلیم سے متعلق جوبھی مشکلات درپیش آتیں ان سے مولانا کومطلع کرتے۔چنانچہ ۱۳/اکتوبر ۱۸۹۹ء کے اپنے مکتوب میں علامہ شبلی مولانا شروانی کوندوہ کے عام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''اگرآپ یہ چاہتے ہیں کہ ندوہ کی خدمت کرسکوں تو دس پندرہ دن کے لیےلکھنؤ میں آکر قیام کیجیے، میں کارروائی اور طرزِ عمل کا نقشہ پیش کروں گا،اس پررائے دیجیےاور ارکان بھی پورےغوروفکر کے ساتھ بحثیں کریں، پھر جوامر منقح قرار پائے اس پرعمل کیا جائے اوراس کا خاکہ ڈالا جائے۔اس وقت جس طرح کام ہورہاہےاس میں شریک ہونا میں قومی گناہ سمجھتا ہوں اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی معراجِ خیال ہے۔پھرمیری کھپت وہاں کیسے ہوسکتی ہے۔اتمام حجت کے لیے میں جلدتر لکھنؤ جانے والا ہوں۔''[11]

ندوہ میں انگریزی کی ابتدا پراظہارِ مسرت کرتے ہوئے علامہ شبلی اپنے ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:''مکرمی!ندوہ اب راہ پرآتا جاتا ہے۔انگریزی جاری ہوگئی، سرمایہ الہ آباد بنک میں رکھا گیا،خیر بعدازخرابی بسیار سہی،اب ندوہ میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔اب نکتہ چینی کی خدمت ادا کرتا ہوں۔''[12]

ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شروانی تحریک ندوہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے اور ندوہ کو بھی آپ پر پورا بھروسہ تھا۔ارکانِ ندوہ اور بہی خواہانِ ندوہ کوآپ پر ناز تھا۔علامہ شبلی بھی ان ہی بہی خواہوں میں سے ایک تھے جوندوہ کواس کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ندوہ کے لیےمولانا شروانی کی ہمہ وقت فکرمندی کے مدنظر علامہ شبلی ندوہ کی بہتری کےسلسلے میں اپنے خیالات سے مطلع کرتے تھے۔۵/ستمبر ۱۹۰۲ء کےاپنے ایک خط میں علامہ شبلی مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:''مکرمی، ندوہ کا اب نفس واپسیں نظرآتا ہے۔اس بنا پر بطورِ حرکت مذبوحی کے یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دومہینہ کی رخصت لے کرلکھنؤ آؤں اورکم ازکم دوچیزوں کو درست اور جاری کرادوں۔نصاب اور رسالہ ماہانہ۔اس کے سواعام تدابیر بھی سوچی جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کم از کم ایک مہینہ لکھنؤ میں آکر رہیں۔میں بغیرآپ کے کچھ کام کرنا نہیں چاہتا اور نہ کرسکتا،اگرآپ اپنے

۱۱۔مکاتیب شبلی،(مکتوب نمبر ۲۰) دارالمصنفین،شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ،۱۹۶۶ء،ص ۱۲۱-۱۲۲

۱۲۔ماخذ سابق،(مکتوب نمبر۳۳)

کام کا ذاتی ہرج کر کے آسکیں تو فوراً لکھیے ، ورنہ ندوہ کو الوداع کہیے ....[۱۳]

دراصل ، علامہ شبلی بھی مولانا شروانی کی طرح ان چنندہ اولین علماء میں سے ایک تھے جنھوں نے تحریکِ ندوہ اور اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا۔ وہ ندوہ کے قیام اور نصابِ تعلیم کی اصلاح کے ذریعے ہندستانی مدارس کو تنزلی کے دلدل سے نکال کر ترقی کی بلندی پر پہنچانا چاہتے تھے۔ اسلامی درس گاہوں میں زیرِ تعلیم نئی نسل کی دنیا سے بے خبری ان کو بے چین کیے دیتی تھی۔ علامہ شبلی کی ندوہ سے خیر خواہی اور عام مدارس کے تئیں ان کی دردمندی اور بے چینی کی تصویر کشی علامہ سید سلیمان ندوی نے یوں کھینچی ہے:

> عام ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی ۔علما ہر طرف سے آ آ کر شریک ہونے لگے۔ اس صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں ایک نام اس کا بھی تھا جو ہندستان کے علاوہ روم وشام و مصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور اس کے دل میں رہ رہ کر ان مدارس کی زبوں حالی ، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بے خبری کا درد اٹھتا تھا ،جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر دفعہ نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا۔[۱۴]

علم وفن کے میدان میں علامہ شبلی کی جہاں نوردی اور معاصر دنیا میں تعلیمی اصلاحات پر گہری نظر کی وجہ سے اُنھیں ندوہ کی نصاب کمیٹی کا ممبر بنایا گیا۔ علامہ شبلی کے نزدیک نصابِ تعلیم ندوۃ العلماء کی وہ مضبوط بنیاد تھی جس پر اس کی پائے دار اور عالی شان عمارت کو کھڑا ہونا تھا۔ اسی لیے وہ نصابِ تعلیم کی جامعیت اور زمانہ سے اس کی مطابقت پر زور دیتے تھے۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح سے علامہ شبلی ایسے افراد تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو قدیم و جدید کے سنگم ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ درسیات میں وہی کتابیں رکھی جائیں جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ وہ قدیم نصاب تعلیم کو ندوہ میں من وعن پڑھائے جانے کے حق میں نہیں تھے۔ بلکہ کچھ مخلوط الفن کتابوں کی جگہ دوسری کتابیں داخلِ نصاب دیکھنا چاہتے تھے۔

اُدھر مولانا شروانی خود بھی قدیم و جدید ثقافت کے حامل تھے اور اس میں توازن ان کا امتیاز تھا۔ اسی لیے انھیں ندوہ کے نصابِ تعلیم کا ناظم اور معتمد بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ندوہ سے جاری ایک نقشۂ نصابِ تعلیم پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سخت لب ولہجہ کے ساتھ ایک خط میں علامہ شبلی اپنے محرمِ اسرار مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

۱۳۔ ماخذ سابق۔ (مکتوب نمبر۴۲) ص ۱۴۴

۱۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۵

مکرمی، آج ایک نقشہ نصابِ جاریہ دارالعلوم ندوہ کا آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال، شرح جامی، فصولِ اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ۔ مکرمی، ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے۔ آپ نصاب کے ناظم ہیں... مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں اختلاف تھا، لیکن جس میں اتفاق تھا وہ کہاں ہیں، ان مدرّسوں کو کہیے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ ان ظالموں کو شرم نہیں آتی، افسوس، افسوس۔ ۱۵

علامہ شبلی نے ایک دوسرے طویل مکتوب میں درجہ وار جامع نصابِ تعلیم کا خاکہ پیش کرتے ہوئے مولانا شروانی کو لکھا:

...لیکن خدا کے لیے پھر پنچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھیے گا، کوئی کتاب نئی قائم کی جائے خواہ نہ کی جائے لیکن کافیہ، شافیہ، شرحِ جامی، میر زاہد، ملاحسن، ملا جلال، قاضی یہ تو قطعاً نکلوا دیجیے۔ خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے یہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے۔ [۱۶]

مولانا شروانی کے نام علامہ شبلی کے مذکورہ بالا خطوط سے تحریکِ ندوۃ العلماء میں مولانا شروانی کے مقام اور ان کی اہمیت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

ندوہ سے مولانا شیروانی کے بےلوث تعلق اور مضبوط رشتے کا اندازہ اس تعزیتی پیغام سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ان کے انتقال کے بعد ندوہ کی مجلسِ انتظامی نے شائع کیا۔ اس تعزیتی بیان میں یوں کہا گیا:

مجلس انتظامی کا یہ جلسہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی وفاتِ حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ نواب صاحب مرحوم ندوۃ العلما کے بانیوں میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور دارالعلوم کے تخیل اور نصب العین کے متعلق انھیں پورا شرحِ صدر تھا اور اس کے لیے اخیر عمر تک جدوجہد کرتے رہے تھے اور ناظم ندوۃ العلما کی رہنمائی اور مدد میں موصوف پیش پیش رہے۔ اور آخر عمر تک جلسہ ہائے انتظامی کی شرکت کے لیے باوجود ضعف، پیری اور بیماریوں کے زحمت سفر گوارا فرماتے رہے۔ موصوف کی وفات سے ندوۃ العلما ایک بڑے محسن اور مخلص رکن اور بزرگ سرپرست سے محروم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں رحمتِ خاصہ سے نوازے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ [۱۷]

۱۵۔ ماخذ سابق، (مکتوب نمبر ۴۸) ص ۱۴۹

۱۶۔ ماخذ سابق، (مکتوب نمبر ۵۳) ص ۱۵۳-۱۵۴

۱۷۔ صدر یار جنگ، مولانا شمس تبریز خان، مجلس صحافت و نشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۱۱ء، ص: ۱۶۳-۱۶۴

جزاور جزو کی بحث

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

majmal1953@gmail.com

اردو، فارسی اور عربی کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵-۱۹۷۲) کا ایک مضمون اس عنوان سے ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کے رسالے ''معیار'' پٹنہ میں شائع ہوا تھا[۱]۔ صدیقی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے مجموعہ مقالات کا پہلا حصہ شائع ہوا تو یہ مضمون بھی اس کی زینت بنا[۲]۔ اس طویل عرصے میں اس موضوع پر راقم کے محدود علم کے مطابق کوئی اور باقاعدہ تحریر سامنے نہیں آئی۔ رشید حسن خاں نے اردو املا میں البتہ اس لفظ پر لکھا ہے مگر وہ دراصل صدیقی صاحب کے مضمون سے مستفاد ہے اور خاں صاحب نے اس کا حوالہ بھی دیا ہے[۳]۔

اردو میں ''جز'' کی صورت کے دو لفظ مستعمل ہیں۔ ایک علاوہ سوا اور دیگر کے معنی میں ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک[۴]

اس معنی میں یہ لفظ ٹھیٹھ فارسی ہے۔

دوسرا لفظ جو ٹکڑے اور حصے کے معنی میں آتا ہے، اس کی اصل عربی لفظ ''جزء'' ہمزے کے ساتھ ہے۔ عربی میں اس کی جمع بھی ہمزے کے ساتھ اجزاء آتی ہے۔ یہ دوسرا لفظ فارسی اور اردو میں عموماً دو

۱۔ جلد ۱، شمارہ ۵، ۶ جولائی و اگست ۱۹۳۶ء، ص ۳۶۲-۳۶۶

۲۔ مقالات صدیقی مرتبہ: مسلم صدیقی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص ۹۶-۱۰۲، یہ حصہ مجلس ترقی ادب لاہور سے بھی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں یہ مضمون ص ۹۹-۱۰۴ پر ملاحظہ ہو۔

۳۔ اردو املا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طبع سوم، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۵

۴۔ دیوان غالب، مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی، نقش ثانی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۸۲ء، ص ۲۱۳

صورتوں میں رائج ہے۔ایک جز ہمزے کے بغیر اور دوسری صورت واو کے ساتھ ''جزو''۔

بغیر ترکیب کے یہ لفظ تنہا آئے تو ''جز'' اور ''جزء'' دونوں کا استعمال عام ہے۔لیکن جب مضاف یا موصوف ہو تو واو کے ساتھ ''جزو'' کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔مثالیں مرزا ہی کے کلام سے ملاحظہ ہوں۔

مضاف کی مثال:

ہے بوئے گل غریب تسلی گہ وطن ہر جزوِ آشیاں پرِ پرواز ہے مجھے [۵]

موصوف کی مثال:

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے [۶]

غیر مرکب کی مثال:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا [۷]

یائے نسبتی کے ساتھ بھی بیشتر جزوی کہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے مضمون کے آخر میں فارسی لفظ ''جز'' بمعنی سوا کی اصل اور اشتقاق پر بھی گفتگو کی ہے جو دلچسپ اور چشم کشا ہے، مگر ان کے مضمون کا بنیادی موضوع عربی الاصل لفظ کی دو صورتیں ''جز'' اور ''جزو'' ہیں۔راقم نے بھی یہ بحث دوبارہ اسی عربی لفظ کے بارے میں چھیڑی ہے۔

صدیقی صاحب نے بہار عجم سے لفظ ''جز'' کی تشریح نقل کی ہے اور اس کا خلاصہ اردو میں چند نکات کی صورت میں درج کیا ہے۔ان میں چوتھا نکتہ انھی کے الفاظ میں یہ ہے:

فارسی میں اضافت کی صورت میں ہمزہ کی جگہ واو لکھتے اور بولتے ہیں یعنی جزو۔

بہار عجم کی اصل عبارت یہ ہے:

وچون آں را مضاف نمایند بہ چیزے، بجائے ہمزہ واو نویسند، وگویند: جزوِ لا ہم طلاست، و ہم چنیں جزو یدن۔[۸]

۵۔ دیوان غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۰۵

۶۔ ماخذ سابق، ص ۳۰۰

۷۔ ماخذ سابق، ص ۱۹۴

۸۔ ٹیک چند بہار، بہار عجم، تصحیح دکتر کاظم دزفولیان، انتشارات طلایہ، طہران، ۱۳۷۹ ق ش، جلد اول، ص ۶۱۴

صدیقی صاحب کے نزدیک ''جز'' (ہمزے کے بغیر) کی طرح ''جزو'' (واو کے ساتھ) بھی عربی لفظ ''جزء'' کا مفرس ہے، جیسا کہ اس لفظ پر بحث کے خاتمے میں لکھتے ہیں کہ ''جزء اور اس کے مفرس (جز) اور (جزو) کی بحث تو ختم ہوئی'' (ص۱۰۳)، مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''جز'' کی تفریس فارسی قاعدے کے مطابق ہے۔ فارسی کے حروف تہجی میں ہمزہ نہیں پایا جاتا اس لئے عربی کے جن الفاظ کے آخر میں ہمزہ آتا ہے، فارسی میں ان کا ہمزہ حذف کردیتے ہیں۔

رہا ''جزو'' کا معاملہ تو صدیقی صاحب کو اس کے استعمال کے جواز بلکہ فصاحت میں بھی شک نہیں ہے کیوں کہ اہل زبان نے نظم ونثر دونوں میں اسے استعمال کیا ہے، البتہ ان کا خیال ہے کہ اسے واو سے لکھنا بنیادی طور پر ایرانی اور ہندوستانی کاتبوں کی غلطی ہے، اور یہ غلطی بعض عرب کاتبوں کی غلطی کی پیروی کا نتیجہ تھی۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ عرب کاتب نے واو سے لکھنے میں اگر غلطی کی تھی تو یہ صرف املا کی غلطی تھی، پڑھنے میں وہ اسے واو کے بجائے ہمزہ پڑھتا تھا۔ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی طرح ''عضو'' کی مانند اس کا تلفظ نہیں کرتا تھا۔ صدیقی صاحب کے مضمون سے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۱۔ پرانے زمانے میں بعضے کاتبوں نے یہ غلطی کی کہ اسی لفظ (جزء) کی جگہ (جزو) لکھنے لگے اور ایران اور ہندوستان کے کاتبوں نے اسی غلط املا کو اختیار کیا۔

۲۔ عرب بیچارے نے اس لفظ کو اگر واو سے لکھ بھی دیا تھا تو تلفظ صرف ہمزہ ہی کا کرتا تھا، واو کو ادا نہ کرتا تھا۔ ہندیوں نے (اور شاید ایرانیوں نے بھی) واو کو اسی طرح ادا کرنا ضروری جانا جیسے عربی لفظوں سہو، لغو، نحو میں جن میں واو اصلی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ (جزوِ دماغ) اور (جزوِ بدن) اور (جزوی) اور (جزوِ لاینفک) فارسی زبان میں جاری ہوگئے۔

سید محمد علی داعی الاسلام نے فرہنگ نظام میں لکھا ہے کہ ''جزو'' جزء کا مبدّل ہے اور فارسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی عربی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[9]

اسی بنا پر بعض ایرانی محققین ''جزو'' کو غلط العام میں شمار کرتے ہیں۔ ڈکٹر عبدالرسول خیام پور نے اپنے مضمون بعنوان ''غلط مشہور'' میں ''جزو'' کا بھی ذکر کیا اور لکھا کہ اس کی اصل ''جزء'' (ہمزے کے ساتھ)

۹۔ سید محمد علی داعی الاسلام، فرہنگِ نظام، شرکت دانش، تہران، ۱۳۶۲ ق ش، جلد دوم، ص ۳۸۶-۳۸۷

ہے مگر شعرا نے اسے واو کے ساتھ استعمال کیا ہے اور لفظ عضو کا ہم قافیہ قرار دیا ہے۔ مثال میں سنائی اور مولانا روم کے اشعار نقل کیے ہیں۔[۱۰]

خاکسار راقم السطور عرض گزار ہے کہ ''جزوْ'' واو کے ساتھ مفرس نہیں ہے بلکہ ''جزءٔ'' کی طرح یہ صورت بھی خالص عربی ہے۔ اور عربی ہی سے فارسی میں آئی۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ فرمانا ہرگز درست نہیں کہ جو عرب واو کے ساتھ ''جزوْ'' لکھتے تھے وہ تلفظ ہمزے کا کرتے تھے اور ہندوستانیوں اور بقول ان کے ''شاید ایرانیوں نے بھی اسے عربی کے الفاظ سہو، لغو، نحو کی طرح (جن میں واو) اصلی ہے ادا کرنا ضروری جانا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عرب اس طرح لکھتے تھے تلفظ بھی واو کا کرتے تھے اور عربی کے مذکورہ واوی الاصل الفاظ کی طرح اسے ادا کرتے تھے۔ یہاں دوسری صدی ہجری کے بعض قدیم اور مشہور شعرا کے کلام سے چند سندیں پیش کی جاتی ہیں جن میں ''جزءٔ'' کا قافیہ انہی واوی الاصل الفاظ کے ساتھ باندھا گیا ہے۔

۱- السید الحمیری (۱۰۵-۱۷۳) دوسری صدی ہجری کا مشہور شیعی شاعر ہے۔ ابن شہر آشوب (ف ۵۸۸ھ) نے مناقب آل ابی طالب میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے جس میں اس نے آنحضرت ﷺ کے ایک معجزے کی حکایت نظم کی ہے۔ اس کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

فقال لها یا فطم قُومی تَناولی ولم یکُ فیما قال ینطِقُ بالْهَزْوِ
هدیَّةَ ربّیٔ اِنَّه متَرجِّمُ فقامت اِلی ما قال تسرِع فی الخطوِ
فجاء ت – علیها اللّٰه صلّی – بحَفنةٍ مکوَّ مةٍ باللَّحم جُزْواً علی جُزْوٍ[۱۱]

یہ واو یہ قصیدہ ہے۔ اس کے دوسرے قوافی میں سہو، نضو، عفو کے الفاظ آئے ہیں اور ان سب میں واو اصلی ہے۔ تیسرے شعر میں ''جزوْ'' کا لفظ دو بار آیا ہے اور دونوں بار واو کے ساتھ، حالانکہ پہلی بار ہمزے کے ساتھ آتا جب بھی مصرعہ وزن سے نہ گرتا۔

۲۔ ابونواس (۱۴۶ - ۱۹۸ھ) عام طور پر شاعر خمریات کے طور پر مشہور ہے۔ شاعر ہونے کے

۱۰۔ مجلّہ دانش کدہ، دورہ ۱، شمارہ ۳ خرداد ۱۳۴۴ ق ش، ص ۲۹-۳۰

۱۱۔ ابن شہر آشوب السروی المازندرانی، مناقب آل ابی طالب، دارالاضواء، بیروت، ۱۹۹۱ء، جلد دوم ص ۹۱

ساتھ وہ عربی کا بھی ممتاز عالم تھا۔اس کا دیوان عربی کے مقتدر ادیبوں مثلاً ابوبکر صولی (ف ۳۳۵)اور حمزہ اصبہانی (ف ۳۶۰ھ) نے مرتب کیا تھا۔قدیم نسخوں کی بنیاد پر جرمن مستشرق ایفالد فاغز نے یہ دیوان پانچ جلدوں میں شائع کیا ہے۔مزید دو جلدیں اس کے اشاریوں پر مشتمل ہیں۔ایک قطعے میں جسے ابوبکر صولی نے باب الزھد میں اور حمزہ نے باب المراثی میں نقل کیا ہے، ابونواس اپنے بڑھاپے کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

دبَّ فيَّ الفناءُ سُفلاً و عُلُوَا وأراني أموت عضواً فعُضوَا

ليس من ساعة مضت بيَّ اِلا نقصتني بمرِها بيَ جُزُوَا [۱۲]

یہاں بھی پہلے شعر میں علو اور عضو کا قافیہ آیا ہے جن کی واو اصلی ہے۔اس قطعے میں تین اشعار اور بھی ہیں جن کے قافیے نضو، لہو، عضو ہیں اور ان تینوں الفاظ میں واو اصلی ہے۔

۳۔ابونواس ہی کا معاصر اور ہم مرتبہ شاعر ابوالعتاہیہ (۱۳۰-۲۱۱ھ) اپنی زہد یہ اور ناصحانہ شاعری سے مشہور ہوا۔اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ما ان يطيب لذى الرِّعاية للـ أيام لا لعب ولا لهُوُ

اِذ كان يطرب فى مسرَّته فيموت من أجزائه جُزوُ [۱۳]

یہاں بھی پہلے شعر کا قافیہ ''لھوٗ'' ہے اور اس میں حرف واو اصلی ہے۔

دوسری صدی ہجری کی ان اسناد سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ ''جزؤ'' کا لفظ واو کے ساتھ مفرس نہیں ہے، بلکہ ''جزؤ'' (ہمزے کے ساتھ) کی طرح یہ صورت بھی عربی زبان میں بہت قدیم ہے اور عرب شعرا اسے عضو، عفو، سہو جیسے واوی الاصل قافیوں کے ساتھ باندھتے رہے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں فارسی کے شعرا نے جب ''عضو'' جیسے واوی الاصل الفاظ کے ساتھ ''جزؤ'' کا قافیہ باندھا، مثلاً حکیم سنائی حدیقۃ الحقیقۃ میں کہتے ہیں:

ھر یکی را بلمس بر عضوی اطلاع اوفتاد بر جزوی [۱۴]

۱۲۔دیوان ابی نواس، تحقیق، ایفالد فاغز، النشرات الاسلامیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء، جلد اول ص ۳۴۵-۳۴۶

۱۳۔ابوالفرج الاصبہانی، کتاب الاغانی، دارالثقافۃ، بیروت، ۱۹۸۱ء، جلد ۴، ص ۵۹

۱۴۔ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی غزنوی، حدیقۃ الحقیقۃ وشریعۃ الطریقۃ، بمبئی ۱۸۵۹ء، ص ۱۹

یا مولانا روم مثنوی میں:

زانکہ بی لذت نروید ہیچ جزو بلکہ لاغر گردد از ھر ہیچ عضو [۱۵]

توانہوں نے عربی لفظ ''جزء'' (ہمزے کے ساتھ) میں اپنی طرف سے کوئی بجا یا بیجا تصرف نہیں کیا تھا، بلکہ عربی میں پہلے سے رائج ایک لفظ کو اسی صورت میں استعمال کیا تھا۔

ممکن ہے بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے محقق اور فارسی کے فرہنگ نویسوں سے یہ تسامح کیسے ہوا کہ انہوں نے جزو کو مفرس قرار دیا؟

اس سوال کا ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اوپر جو اسناد پیش کی گئیں وہ ان حضرات کے پیش نظر نہیں تھیں، اور انہیں تلاش کرنے کی ضرورت اس بنا پر محسوس نہیں ہوئی کہ عربی کے لغات میں واو کے ساتھ ''جزو'' مذکور ہی نہیں۔

لیکن بنیادی وجہ عربی زبان میں ہمزے سے متعلق لسانی مسائل سے کما حقہ واقفیت کا نہ ہونا ہے۔ ان مسائل کی تفصیلات لغت کے بجائے فن صرف اور قراءات کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہ تفصیلات نظر میں نہ ہوں تو اس طرح کے الفاظ پر بحث میں کوئی بھی شخص وہی بات کہے گا جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے مضمون کے شروع میں لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

> اس لفظ کا مادہ (ج ز ء) ہے۔ (جزو) ہرگز نہیں، بلکہ عربی میں (ج ز و) سرے سے کوئی مادہ (کسی اور معنی میں بھی) ہے ہی نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''جزو'' صحیح ہے اس لئے تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ اس لفظ میں واو ہے، مگر یہ واو اصلی نہیں ہوسکتا۔ اب اصل نہیں ہے تو آپ فرمائیں گے کہ زائد ہوگا۔ مگر یہ بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ واو یہاں لام کلمے کی جگہ پر ہے اور فے کلمہ، عین کلمہ، یا لام کلمہ زائد نہیں ہوتا، اصلی ہوتا ہے۔ جب وہ نہ اصلی ہے نہ زائد تو اس کی ہستی موہوم ہے۔

یہ درست ہے کہ مادے کا فے کلمہ، عین کلمہ اور لام کلمہ اصلی ہوتا ہے لیکن لام کلمہ اگر ہمزہ ہو تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ واو یا ی سے بدل جائے۔ اس صورت میں ہمزے کی جگہ پر آنے والا حرف نہ اصلی ہوگا

۱۵۔ مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، آخرین تصحیح ورینولد نیکلسون و مقابلۂ مجدد با نسخۂ قونیہ، تصحیح مجدد و ترجمہ حسن لاہوتی، میراث مکتوب، تہران، ۱۳۹۳ ق ش، جلد سوم، دفتر ششم، ص ۱۲۳۳۔

نہ زائد ہوگا بلکہ ہمزے کا بدل ہوگا۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ ہمزے کے تلفظ کے سلسلے میں عرب قبائل میں اختلاف تھا۔ نجد کے قبائل خصوصاً بنی تمیم ہمزے کا تلفظ اس کے مخرج کے مطابق کرتے تھے، اصطلاح میں اس طریقے کو ''تحقیق'' کہتے ہیں۔ حجاز کے قبائل کا مسلک ''تخفیف'' تھا۔ ہمزہ لفظ کے شروع میں ہوتو وہ بھی اصل مخرج کے مطابق ہی اسے ادا کرتے تھے مگر جب لفظ کے درمیان یا آخر میں آئے تو بعض صورتوں میں اسے حذف کر دیتے یا واو، الف ہی سے بدل دیتے۔ تفصیل جیسا کہ عرض کیا صرف اور قراءات کی کتابوں میں ملے گی۔

لفظ ''جزء'' میں جو تبدیلی ہوئی اس کی وضاحت کے لئے اسی طرح کے بعض دوسرے الفاظ پر غور کرتے ہیں۔

۱۔ جزو کی اسناد میں السید الحمیری کے جو اشعار اوپر گزرے ہیں ان میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانیہ ہے؟

ولم یکُ فیما قال ینطق بالهُزُوِ

''الهــزو'' کا لفظ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں واوی ہے، مگر عربی لغت میں (ھ ز و) سرے سے کوئی مادہ نہیں ہے۔ اس کا لام کلمہ واو ہے اور یہ واو نہ اصلی ہے نہ زائد، مگر اس کی ہستی ''موہوم'' نہیں ہے بلکہ یہ ہمزے کا بدل ہے۔ اس کی اصل ''جزء'' ہی کی مانند ''هُـزْء'' ہے۔ یہ لفظ فعل هَـزَأ کا مصدر ہے، دوسرا مصدر ''هُزُؤ'' ہے۔ اس کا ہمزہ واو سے بدلا تو ''هُزُوٗ'' بن گیا۔ یہی لفظ قرآن مجید میں گیارہ بار حالت نصب میں آیا ہے اور ہر جگہ حفص کی قراءت میں ''هُزُوٗ'' واو کے ساتھ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ''جزو'' کی طرح یہ دونوں لفظ ''هُـزْوٗ'' اور ''هُـزُوٗ'' واو کے ساتھ آپ کو لسان العرب اور تاج العروس جیسے مبسوط لغات میں بھی نہیں ملیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ حقیقت میں یہ مستقل لفظ نہیں ہیں بلکہ ''هُزْء'' اور ''هُزُؤ'' کی ہی متبادل صورتیں ہیں۔

۲۔ سورہ اخلاص کی آخری آیت ''ولم یکن له کفوا أحد'' میں لفظ ''کفو'' واو کے ساتھ آیا ہے۔ اس کا مادہ (ک ف ء) ہمزے کے ساتھ ہے۔ اس سے لفظ ''کفء'' نظیر کے معنی میں آتا ہے۔ اس لفظ کی ایک صورت ''کُفُؤ'' فائے مضموم کے ساتھ ہے۔ پھر ہمزہ واو سے بدلا تو کُفُوٗ بنا اور اس کے بعد فے کو ساکن کرکے کُـفْـوٌ بنایا۔ اس طرح اس لفظ کی چار صورتیں وجود میں آئیں۔ سورہ

اخلاص کی مندرجہ بالا آیت میں حفص کی قراءات کــفـواً واو کے ساتھ ہے،حمزہ اور قالون کی فاے ساکن اور ہمزے کے ساتھ، اور باقی قراے سبعہ فائے مضموم اور ہمزے کے ساتھ پڑھتے ہیں [۱۶]۔

چوتھی صورت ''کُفُو''فاے ساکن اور واو کے ساتھ ابوالعتاہیہ کے درج ذیل شعر میں آئی ہے:

و عُـلِّـقـتُ مـن يـزهُـو عـلـيَّ تجبُّراً   وانّـي فـي كل الخصالِ له كُفُوُ [۱۷]

یہ شعر جس قطعے کا حصہ ہے وہ چھے اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے قافیے خلو،نضو ،حلو،شجو ،زھوسب واوی الاصل ہیں۔لیکن ''کــفــو'' کی اصل جیسا کہ آپ نے دیکھا ہمزہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے ''جزء'' کی اصل ''جزء''میں ہمزہ تھا جو واو سے بدلا تو ''جزو''بن گیا۔

۱۶۔ابن الباذش،الاقناع فی القراءات السبع تحقیق عبدالمجید قطامش،جامعہ ام القری مکہ المکرّمہ ۱۴۰۳ھ جلد دوم ص ۸۱۵

۱۷۔ دیوان ابی العتاہیہ تحقیق شکری فیصل مکتبہ دارالملاح،دمشق،ص ۲۷۳

رامپور رضا لائبریری میں مغلیہ عہد کی یادگاریں

ڈاکٹر تبسم صابر

رامپور رضا لائبریری اینڈ میوزیم

tabassumsabiralig@gmail.com

رامپور رضا لائبریری کو کتابوں کا تاج محل کہا جاتا ہے۔جس طرح تاج محل مغل دور کی یادگار ہے اسی طرح کتابوں کا یہ تاج محل مغل دور کی یادگاروں کو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہے خواہ وہ کتابیں ہوں، دستاویزات ہوں، خطاطی کی وصلیاں ہوں، تصاویر یا سکّے ہوں۔ رامپور رضا لائبریری میں موجود تمام مغل کلیکشن کا احاطہ کر پانا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس موضوع کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ بہرحال چند اشارے ہیں جن کا میں اپنے اس مضمون میں ذکر کروں گی۔

وہ مخطوطات جن پر مغل فرماں رواؤں و دیگر امراء کی مہریں یا تحریریں ہیں:

رامپور رضا لائبریری میں بابر کا ترکی دیوان محفوظ ہے جس پر جا بجا بابر بادشاہ کے قلم سے اصلاحیں ہیں اور آخر میں ایک رباعی خود بابر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔اس کے ترقیمہ کی عبارت سے بیرم خان کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ پوری کتاب بابر کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے شاہجہاں نے اس کے آخری صفحے پر رباعی کے پاس یہ وضاحت کی کہ صرف یہ ترکی رباعی بابر بادشاہ کے قلم سے ہے۔

غالبًا اس تحریر کے علاوہ دنیا میں بابر بادشاہ کی کوئی تحریر نہیں ملتی۔اس ترکی دیوان میں اردو شعر بھی درج ہے جس سے بابر کی ہندی شناسی کا اچھا ثبوت ملتا ہے اور اردو کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عربی میں فن نحو میں ''شرح کافیہ رضی'' کا ایک نسخہ ہے۔جس پر شاہجہاں بادشاہ اور ان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خاں کی تحریروں اور مہروں کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر، غلام علی آزاد بلگرامی اور مغلیہ عہد کے دیگر امراء و منصب داروں کی مہریں اور عرض دیدہ موجود ہیں۔

کلیات سعدی کا ایک مصور نسخہ ۳۲۔۱۵۳۱ء کا ہے اس کے ابتدائی صفحے پر تاریخی اہمیت کی مختلف

مہریں اورعرض دیدہ کے ساتھ عبدالرحیم خان خاناں اور منعم بیگ کی تحریریں ہیں۔

''رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری'' مکتوبہ ۱۵۱۵ء اہم نسخوں میں ہے جس پر جہانگیر، شاہجہاں، اور عبدالرحیم خان خاناں کی تحریریں ثبت ہیں۔ اس دور کے مشہور خطاط سلطان علی مشہدی نے اس نسخے کی کتابت کی ہے۔

اسی طرح ایک نادر مخطوطہ ''رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری وصد پند لقمان'' مکتوبہ ۱۵۳۸ء ہے جسے مغل دور کے مشہور خطاط میر علی کاتب نے نقل کیا ہے اس نسخے پر جہانگیر، شاہجہاں اور شاہجہاں کی بیٹی جہاں آراء کی تحریریں ہیں اور شاہجہاں نے اپنے قلم سے اس پر قیمت ۱۰۰۰ روپے لکھی ہے اور اسے خاصۂ اول سے تعبیر کیا ہے۔

''دیوان جامی'' مکتوبہ ۱۵۰۹ء ایک اہم نسخہ ہے جس پر عہد مغلیہ کے مشہور امراء کی مہروں کے ساتھ اکبر بادشاہ کی والدہ محترمہ حمیدہ بانو بیگم بنت علی اکبر کی نہایت خوبصورت محرابی مہر ثبت ہے اور شاہجہاں کی بیٹی نظر آراء جن کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا ان کی بھی اس کتاب پر مہر موجود ہے۔

''نفحات الانس'' مکتوبہ ۱۵۱۲ء کا ایک عمدہ نسخہ ہے جس کے ابتدائی صفحے پر مغل شہزادہ داراشکوہ کے ہاتھ کی خوش خط تحریر ہے۔

''دیوان ہلالی چغتائی'' مکتوبہ ۱۵۸۵ء کا ایک اہم نادر نسخہ ہے جس پر مغلیہ عہد کے درباری خطاط عبداللہ چلپی کے دستخط اور اعتماد خان، عنایت خان، صادق خان اور عبدالرشید دیلمی وغیرہ خطاطوں کی مہریں اور عرض دیدے موجود ہیں۔

اس کے علاوہ یہاں قرآن مجید کے ایک نسخے پر اکبر بادشاہ کی مہر اور نیچے اس کے میر منشی فیضی کے دستخط ثبت ہیں۔

مغلیہ عہد کی خطاطی کے نمونے: بابر سے بہادر شاہ ظفر تک تمام مغل حکمرانوں نے فن خطاطی کی آبیاری کی ہے۔ بابر خود ایک ماہر خطاط تھا اس نے ایک خط ایجاد کیا تھا جو خط بابری کے نام سے موسوم ہے۔ بابر کے قلم سے لکھی ہوئی ایک رباعی اس کے ترکی دیوان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

محمد فرخ سیر بادشاہ کی حلیہ مبارک نبی اکرم ﷺ کی شان میں تیار کی ہوئی ۶ منظوم وصلیاں ہیں جو خط نسخ و نستعلیق میں ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۸ء تک تیار ہوئی ہیں۔

رامپور رضا لائبریری میں مغل فرماں رواؤں کی تحریروں کے علاوہ مغل عہد کے مشہور خطاطوں کی وصلیاں ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

محمد بیرم خان کے ترکی دیوان کا ایک اہم اور نادر نسخہ ہے جو نہایت خوشخط و منقش ہے۔

مزید برآں بابر بادشاہ کے بیٹے کامران کا فارسی دیوان "دیوان مرزا کامران" کا مطلّا و مذھب نسخہ موجود ہے۔

فرخ سیر کے عہد میں تیار کی ہوئی عبدالباقی حداد و دیگر خطاطوں محمد علی، علی الغفار، حافظ غلام محمد، علی اکبر، محمد حفیظ خاں، یاقوت خاں، مظفر حسین وغیرہ کی ۳۳ وصلیوں پر مشتمل البم ہے جو عربی زبان میں ہفت خط میں ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ۱۶۷۶ء کی خطاطی کی البم ہے جس میں حاجی عبداللہ کی تیار کردہ ۱۴ وصلیاں شامل ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر کے عہد کے ہی ایک دوسرے خطاط میرزا جعفر ملقب بہ کفایت خان کی زبان عربی، خط نستعلیق میں ۲۴ وصلیوں کی البم ہے۔

اسی دور کے عبدالباقی حداد کی ایک ۱۸ وصلیوں کی البم اور ایک ۴۰ وصلیوں کی البم ہے جو عربی زبان میں خط ثلث و نسخ میں ہے۔ انھیں کی تیار کی ہوئی ۳۰ وصلیوں پر مشتمل ایک اور البم ہے جس میں نسخ یاقوتی میں وصلیاں تیار کی گئیں ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف خوشنویسوں محمد صادق، عبدالغفار، ابوالمعالی الجلالی، ابوالبقا الموسوی، محمد علی، سید علی حسینی جواہر رقم وغیرہ کی تیار کی ہوئی ۳۵ وصلیوں کی البم موجود ہے

شاہجہاں کے عہد کے مشہور خطاط عبدالباقی حداد یاقوت رقم کی تیار کی ہوئی ۹ وصلیوں کی البم ہے۔

شاہجہاں کے دور میں ہی میر عماد الحسنی و آقا عبدالرشید دیلمی کی تیار کی ہوئی ۱۸ وصلیوں کی البم ہے۔

اکبر کے دور کے مشہور خوشنویسوں محمد مقیم، محمد الحسنی، میر علی ہروی، سید مبارک بزرگ رضوی، محمد عارف، فضل اللہ، سہراب، جواہر رقم ثانی، عبداللہ الحسینی، آصف مشکین قلم، محمد علی اور اقبال الدولہ وغیرہ کی تیار کی ہوئی ۲۳ وصلیوں کی البم موجود ہے۔

نواب واجد علی شاہ کے عہد میں محمد حامد علی مرصع رقم کی تیار کی ہوئی خط نسخ میں ۱۴ وصلیاں ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کے دور کے خطاط عباد اللہ بیگ و دیگر خطاطوں سید امیر رضوی (میر پنجہ کش)، محمد عبیداللہ وغیرہ کی عربی و فارسی زبان میں خط نستعلیق میں ۲۹ وصلیوں کی البم ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے دور میں ولی عہد ابوظفر بہادر کی تیار کی ہوئی خط طغرا التعمیہ میں اوسط قلم سے خط نسخ

میں آیۃ الکرسی تحریر ہے۔

یہ تمام وصلیاں اصفہانی اور مغلیہ صناعی کا نادر نمونہ ہیں۔

مغل عہد کی تصاویر: رامپور رضا لائبریری نادر مصور مخطوطات کا بھی اہم ذخیرہ رکھتی ہے اور یہاں چھوٹے سائز کی پانچ ہزار miniature تصاویر ہیں۔ جو چودھویں صدی سے انیسویں صدی تک کے فن مصوری کے مختلف اسکولوں جیسے ترک ومنگول، مغل، راجپوت، راجستھانی، کشنگنج، پہاڑی، کانگرہ، دکنی، اودھ اور کمپنی وغیرہ کے فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

رامپور رضا لائبریری میں مغل دور میں لکھا ہوا فردوسی کے شاہنامہ کا باتصویر مخطوطہ موجود ہے جس میں ۵۲ رنگین تصاویر ہیں۔ یہ مخطوطہ ۱۴۳۰ء کا ہے۔

نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کا ایک باتصویر مخطوطہ ہے۔ جو خوبصورت نستعلیق خط میں ۴۳-۱۵۴۲ء کا ہے۔

ایک باتصویر قلمی نسخہ عبدالرحمان جامی کا ہے جسے جمال الدین کاتب شیرازی نے خط نستعلیق میں ۷۰-۱۵۶۹ء میں کتابت کیا ہے۔

مغل دور کے نادر مخطوطات میں ''دیوان حافظ'' کا ایک نہایت نادر اور اہم نسخہ ہے جسے خود اکبر بادشاہ نے اپنے لیے تیار کرایا تھا، مخطوطہ دلکش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ اس میں اکبر کے درباری مصوروں کی بنائی ہوئی گیارہ تصویریں ہیں۔ اس میں ایک تصویر میں اکبر، دیوان حافظ کی سماعت کر رہا ہے اور سامنے ابوالفضل، فیضی اور ابوالفتح بیٹھے ہوئے ہیں اس تصویر کو 'نہا' نامی مصور نے بنایا ہے۔ ایک دوسری تصویر میں درویش خانقاہ میں حالت وجد کی کیفیت میں رقص میں مشغول ہیں۔ ایک نوجوان شہزادہ کسی پتھریلے علاقے میں ہے یہ تصویر صنوالہ نامی مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک معزز شخص باغ میں موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا ہے یہ تصویر فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ہے۔ ایک شہزادہ پتھریلے، چٹیل میدان میں گھڑسواری کرتا ہوا ہے جسے مصور منوہر نے بنایا ہے۔ ایک تصویر فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ہے جس میں شہزادہ کو کسی بوڑھے شخص اور دوسرے دانشوروں سے پرندوں کے ایک جھنڈ سے متعلق گفتگو میں مشغول دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں ترک حمام کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں شہزادہ کے شراب سے لطف اندوز ہونے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ تصویر مصور نرسنگھ کی بنائی ہوئی ہے یہ تمام تصاویر سولھویں صدی کے طرز زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔

ایک دیگر اہم باتصویر مخطوطہ ابوالمعالی کی 'کلیلہ دمنہ' کا ہے جو فارسی نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔

اس نسخے کی سلطان محمد بن نور اللہ نے سولہویں صدی عیسوی میں کتابت کی ہے۔ سنسکرت کی مشہور کتاب 'پنچ تنتر' کے اس فارسی ترجمہ میں کہانیوں کی مناسبت سے رنگین تصاویر شامل ہیں۔ وزارت ثقافت، حکومت ہند نے اس مخطوطہ کو World Heritage Manuscripts میں شامل کیا ہے۔

بادشاہ اکبر کے عہد کی (۱۷۵) تصاویر کی البم ہے جو طلسم کے نام سے موسوم ہے یہ تصاویر اکبر کے دور کے مشہور مصوروں نے فتح پور سیکری میں بنائی ہیں۔ یہ تصاویر سولہویں صدی میں ہندوستانی لوگوں کے اعتقادات اور ان کی روایات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ تصاویر (illustrations) ایسا نادر نمونہ ہیں جو اس دور کے مختلف پیشہ وروں مثلاً، تاجروں، کسانوں، دانشوروں، موسیقاروں، جادوگروں اور شعبدہ بازوں کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچتی ہیں۔ ان تصویروں میں مصوروں نے شعبدہ بازیوں اور ما فوق الفطرت عناصر کا نقشہ بہت ہی احتیاط کے ساتھ کھینچا ہے۔ باوجود اس کے مصوروں نے اپنے نام کہیں نہیں لکھے ہیں ان کی شناخت ان کے فنی تجزیے سے ہی کی جا سکتی ہے۔

اکبر کی طاقت و رشخصیت کو اس کے پیدائشی ستارے کی علامت 'برج اسد' یا انگریزی میں 'لیو' کے مطابق ایک بڑی تصویر میں اس طرح دکھایا گیا ہے کہ وہ شیروں، چیتوں، تیندووں، اور اس نوع کے دوسرے جانوروں میں سب سے اوپر دکھایا گیا ہے۔ توانائی کی علامت سورج اس کے ماتھے پر چمک رہی ہے یہ اس البم کی سب سے شاہکار تصویر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی تصویریں ہیں جن میں پیدائشی ستاروں کی علامت اور متوجہ کرنے والی چھوٹے کیڑے مکوڑوں، سانپ اور انسانی کھوپڑیوں کی تصویریں ہیں۔

یہاں مغل مصوری کی (۳۲) البم موجود ہیں جن میں سولہویں، سترہویں صدی کے درمیان ہندوستان کی سماجی معاشیات کی تصویرکشی کی گئی ہے۔

مزید براں یہاں فارسی میں بالمیکی نرائن کا ایک باتصویر مخطوطہ ہے جسے مغل بادشاہ فرخ سیر کے دور میں ۱۷۱۵ء میں سمیر چند نے سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے۔ اس مخطوطہ میں ۲۵۸ تصاویر شامل ہیں اس کے ابتدائی دو صفحات حد درجہ مطلا و مذہب ہیں۔ اتنی زیادہ تعداد میں تصویریں ذخیرہ مخطوطات کے کسی بھی مصور نسخے میں نہیں ہیں۔ اس مخطوطہ کو بھی وزارت ثقافت، حکومت ہند نے World Heritage Manuscripts کا درجہ دیا ہے۔

اس کے علاوہ گلستان سعدی، دیوان عرفی شیرازی، مجالس العشاق نامی کتابوں کے قلمی نسخے ہیں جو اس وقت کے رائج خانقاہی اور صوفی نظام، ملبوسات، روزمرہ کے استعمال کی چیزوں اور فرنیچر وغیرہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ ''مجالس العشاق'' مصنفہ شہزادہ کمال الدین کے نسخہ پر عہد مغلیہ کے متعدد امراء مثلاً عبدالرشید دیلمی، امانت خان شیرازی وغیرہ کی مہریں ثبت ہیں۔

اس کے علاوہ اہم مصور نسخوں میں مثنوی ''مہر ومشتری'' مکتوبہ ۱۵۳۷ء، ''خمسہ نظامی'' ۱۵۴۲ء، ''خمسہ خسروؒ'' مکتوبہ ۱۵۴۸ء، ''مثنوی حسن ودل'' مکتوبہ ۱۵۰۳ء، ''فتوح الحرمین'' مکتوبہ ۱۵۶۹ء، ''شیریں خسروؒ''، ''دیوان خجند'' مکتوبہ ۱۵۹۸ء، ''تاریخ المعجم فی ذکر ملوک العجم'' مکتوبہ ۱۷۹۳ء، ''وغیرہ نہایت اہم اور نادر نسخے ہیں۔ جو سولہویں صدی عیسوی کے ایرانی اور مغل فن مصوری کی نمائندگی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں مغلیہ تاریخ سے متعلق اور بھی بیش قیمت مخطوطات اور مطبوعات موجود ہیں۔

وہ طلبہ یا محققین جو اس سلسلے کی مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ لائبریری میں موجود ان کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

1) Mughal and Persian Paintings and Illustrated Manuscripts inRampur Raza Library by Barbara Schmitz; Ziyadud-Din A. Desai

2) Catalogue of the exhibition of Paintings of Rampur Raza Library published by Rampur Raza Library with colabration of India International Center

3) Catalogue of the Calligraphy in Rampur Raza Library published by Rampur Raza Library

4) Hindi -Urdu catalogue of Rampur Raza Library

ہندوستانی مدارس میں اردو زبان کی تعلیم : مسائل ومواقع

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

گیسٹ فیکلٹی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

anisurrahman1@jmi.ac.in

اردو بنیادی طور پر ایک ہندآریائی زبان ہے اور حکومت ہند کی جانب سے منظور شدہ زبانیں ۲۲ ہیں۔اردو ان زبانوں میں سے ایک ہے۔ڈاکٹر عطش درانی اپنی کتاب ''علم تدریس اردو'' میں لکھتے ہیں کہ دنیا میں بولنے کے اعتبار سے اردو دوسرے درجہ پر ہے[1]۔آج یہ زبان تمام ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان ہے، اور خوشبو بن کر دنیا کے تمام خطوں اور علاقوں میں بکھر چکی ہے اور لوگوں کے ذہن و دماغ کو معطر کر رہی ہے ان جگہوں پر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے جہاں پہلے اس کا وجود نہیں تھا اور اس کا سہرا اردو کے ان چاہنے والوں کو جاتا ہے جو نامساعد حالات میں بھی اردو کا مشعل تھامے آگے بڑھ رہے ہیں۔

اُردو کی تعلیم وتدریس کی تاریخ پر غور کریں تو یہ چند دنوں کا قصّہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں اردو کے جو ابتدائی آثار ملتے ہیں، ان میں ایک طرف راج دربار اور بادشاہت کا سلسلہ دِکھائی دیتا ہے تو اُسی کے پہلو بہ پہلو صُوفیہ کی خانقاہیں، مدارس اور مکاتب مِل جُل کر تعلیم کا ایک مستحکم نظام قائم کر رہے تھے۔

ڈاکٹر صفدر امام قادری لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں اردو کی ابتدائی تعلیم کو مساجد، مدارس یا خانقاہوں سے الگ کر کے ڈھونڈنا مُشکل ہے۔ یہ بھی دُرست ہے کہ یہ ادارے مذہبی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے تھے اور اِن کا مقصد تبلیغِ اسلام تھا لیکن وہاں زبان کی کوئی تعیین نہیں تھی ہاں یہ سچ ہے کہ اصل کام تو عربی زبان میں ہوتا تھا۔عربی کے ساتھ ساتھ کاروباری جہتوں سے فارسی یا تُرکی کے لیے بھی مواقع پیدا ہو گئے۔ انہی تینوں زبانوں کے ساتھ ساتھ عوامی دباؤ یا ذریعہ تعلیم اور تبادلہ خیالات کی مجبوریوں نے

ا۔ڈاکٹر عطش درانی، علم تدریس اردو، نذیر سنز ایجوکیشنل پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۹۲

اردو کو عہدِ سلطنت کے مدارس میں جگہ دِلائی ہوگی لیکن لسانی حکمرانی تو بہر حال عربی، فارسی اور ترُک کی کے ہاتھ میں رہی اور بادشاہت کے لُٹنے وقت تک اِس میں کوئی خاص تبدیلی سامنے نہیں آئی [۲]۔

یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ برصغیر میں انگریزی حکومت قائم ہوگئی، اہلِ اُردو کے درمیان باضابطہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کا سلسلہ انگریزوں کی آمد اور ان کے اقتدار کے بعد شروع ہوتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے دور میں جو عربی مدارس تھے ان میں سے اکثر کا ذریعۂ تعلیم فارسی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ہوگیا۔ اس وقت علماء کرام کو سب سے بڑی فکر یہ ہوئی، کہ مسلمان، عیسائی مذہب قبول کرنا نہ شروع کر دیں، چنانچہ اس خطرہ سے نپٹنے کے لیے اکابرین ملت سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ فیصلہ ہوا کہ دینی اسلامی مدارس قائم کئے جائیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد مسلمانوں نے اپنی بقاء کے لیے دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالمصنّفین اعظم گڑھ جیسے ادارے قائم کیے۔

۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ چنانچہ اس نے دینی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کی۔ اور یہاں سے فیض یافتہ علماء ملک کے دوسرے حصوں میں اسی طرز کے مدارس قائم کرتے چلے گئے جن میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔

آزادی سے قبل ہی جید علماء نے قرآن پاک کے تراجم وتفاسیر اردو میں تالیف کیں، اس طرح انہوں نے گھر گھر میں اردو کو پہنچا دیا۔ مردوں کے علاوہ گھر کی وہ خواتین اور لڑکیاں جنھوں نے اسکول اور کالج کا منہ تک نہیں دیکھا وہ بھی ترجمہ قرآن شریف اور احادیث پڑھنے کے شوق میں اردو سے واقف ہوتی چلی گئیں۔ ان ہی مدارس کے فیض یافتہ علماء نے دینی و اصلاحی کتابوں کے انبار لگا دیے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ''بہشتی زیور'' سے تقریباً ہر گھر میں خواتین نے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ شادی کے وقت مسلم لڑکیوں کو تحفہ میں یہ کتاب بھی دی جانے لگی:

بہشتی زیور (۱۳۲۰ھ) نسائی ادب میں بلاشبہ اپنے وقت کی اہم کتاب ہے جو تقریباً ایک سو سولہ (۱۱۶) برس قبل شائع ہوئی تھی، جس کی اشاعت تسلسل کے ساتھ آج تک ہو رہی ہے۔ اس کتاب کو

۲۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری، ''اردو میں تدریس، آموزش اور آزمائش: مسائل اور امکانات''، ''ادبی میراث''، ۲۳ نومبر ۲۰۲۱ء https://adbimiras.com

اپنے عہد کی خواتین کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے[۳]۔

اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار: کسی نظام تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کا تجزیہ کرنا ہو تو یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے طے کردہ مقاصد واہداف کے حصول میں کتنا کامیاب یا ناکام رہا ہے۔ ہندوستان میں جو چھوٹے بڑے ہزاروں دینی مدارس کام کر رہے ہیں، ان کے قیام کے مقاصد کیا ہیں؟ ان مقاصد کو دو نکات میں شمار کیا جا سکتا ہے:

(۱) ایسے علماء تیار کیے جائیں جو دینی علوم میں مہارت رکھتے ہوں اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل ہوں۔

(۲) یہ علماء عام مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کی ضرورت پوری کر سکیں۔

ہمارے دینی مدارس اَہداف کے حصول میں ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں اور معاشرے میں اس وقت جو بھی دینی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، وہ انہی علماء کی جد و جہد کا نتیجہ ہیں۔

مدارس بالعموم ان ہی دو نکات پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں، اردو زبان کا فروغ اس کے اہداف و مقاصد میں کہیں بھی شامل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مدارس کا اردو کے تعلق سے جو قابل قدر کارنامہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

سرکاری سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی دانستہ طور پر اردو کی طرف سے چشم پوشی کی جاتی رہی تا کہ اردو کی عمارت از خود زمیں بوس ہو جائے لیکن مدارس کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کو صرف ذریعہ تعلیم ہی نہیں بنایا بلکہ طلبہ کے اندر اردو میں مضامین اور مقالے لکھنے کا ذوق پیدا کیا، خطابت میں ماہر بنایا اور گاؤں گاؤں مدارس قائم کر دیے جس نے صرف اسکولوں کی کمی ہی نہیں پوری کی بلکہ اسکولوں کے مقابلے میں اردو کو کئی گنا فروغ بخشا۔

فارغینِ مدارس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے براعظم ایشیا میں بلا مبالغہ کروڑوں صفحات اردو میں لکھے ہوں گے، جن کی ہزاروں کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں اور یہ سب اردو کی پرورش کر رہے ہیں۔

۳۔ محمد عارف اقبال، ''دور حاضر میں اردو زبان کی کثیر الاشاعت تصانیف، اردو بک ریویو، دہلی، اپریل۔ستمبر ۲۰۱۳ء ص ۱۷

آج ملک کے گوشے گوشے میں ایسے بے شمار مدارس قائم ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے۔ان میں سے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعہ سلفیہ بنارس، مدرسہ شاہی مرادآباد، دارالعلوم مئوناتھ بھنجن، مدرسہ مفتاح العلوم مئو اور نہ جانے کتنے ایسے ادارے ہیں جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے، جو دینیات کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اردو صرف بول چال کی زبان رہ جاتی، لکھنے پڑھنے کی نہیں۔اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مدارس نے مسلمانوں کے دین کے ساتھ اردو جیسی شیریں زبان کو بھی مرنے سے بچالیا۔ملک بھر کی سرکاری دانش گاہوں سے زیادہ اردو کے طلبہ مدارس سے نکلتے ہیں۔جو اردو کے فروغ کا اہم ذریعہ بنتے ہیں۔

مکاتب اور مدارس اسلامیہ میں تعلیم کا میڈیم زیادہ تر اردو ہے، اس لیے بھی یہاں تعلیم حاصل کرنے والے صد فی صد طلبہ اردو داں اور اردو خواں ہوتے ہیں اور انہیں میں سے بعض مستقبل میں اردو کے نامور ادیب، شاعر، مصنف اور خطیب بھی ہوتے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، شوق نیموی، تمنا عمادی، علامہ شفیق جونپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا ارشد القادری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا عامر عثمانی، مولانا فتیم الحق گیاوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ریاست علی ظفر بجنوری، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط، فضا ابن فیضی، مجروح سلطان پوری، مولانا وحیدالدین خان، محمد سالم جامعی وغیرہم کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کا شمار اردو کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے اور یہ تمام ہی اردو زبان وادب کے ادیب ونقیب مدارس اسلامیہ کے ہی فیض یافتہ ہیں ان میں سے بیشتر تصنیف وتالیف، شعرو شاعری، انشاء پردازی اور خطابت میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

اہل مدارس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اردو زبان کے صحیح تلفظ، معنویت اور استعمال سے وہ بخوبی

واقف ہوتے ہیں۔

چونکہ برّصغیر کے اکثر علاقوں میں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس لیے یہاں کے مدارس نے اہم وسیلہ کے طور پر اردو زبان کی تعلیم کو اپنے نصاب میں اوّلیت کا درجہ دیا، بلکہ جن علاقوں میں اردو زبان نہ بولی جاتی ہے، نہ سمجھی جاتی ہے، وہاں بھی مدارس نے اردو زبان کی باضابطہ تعلیم کا نظام قائم کر رکھا ہے، مثلاً شمال مشرقی علاقے منی پور، آسام، میگھالیہ، بنگال اور دوسری طرف گجرات، کرناٹک، تمل ناڈو اور کیرالہ کے مدارس کا جائزہ لیجئے، تو پتہ چلے گا کہ مدارس نے اردو کے فروغ کے لیے محنتیں کی ہیں، انہیں مدارس کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عربی کے بعد اسلامیات کا سب سے بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے، مدارس کے فضلاء کی ایک بڑی تعداد، اردو ادب، اردو صحافت اور اردو شاعری کے حوالے سے بھی نمایاں خدمات انجام دیتی آ رہی ہے، چنانچہ اردو کا کوئی نیا یا پرانا اخبار یا رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجئے، مختلف موضوعات پر فضلاء مدارس کے قیمتی مضامین و مقالات اوّل نظر میں مل جائیں گے، ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اور اردو زبان و بیان کا یہ ذوقِ سلیم انہوں نے مدارس ہی سے حاصل کیا ہے، کیوں کہ مدارس میں اس کے لئے مختلف سطح پر محنت کرائی جاتی ہے۔ ذیل میں چند باتوں کا تذکرہ اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مدارس میں اردو انجمن کا ایک نظام ہے جس کے تحت ہر جمعرات کو تقریری پروگرام منعقد کیا جاتا ہے تا کہ طلباء کے اندر زبان و بیان کا ملکہ پیدا ہو، اس میں ہر طالب علم کے لئے معیاری زبان میں تقریر کرنا لازم ہے۔ اس انجمن کی خاص بات یہ ہے کہ سارا نظام طلبہ کے ہی سپرد ہوتا ہے۔

(۲) اردو جداری مجلّات مدارس اسلامیہ کی خاص ایجاد ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ کی ایک مجلس ادارت بنائی جاتی ہے، جو ماہانہ، پندرہ روزہ، یا ہفتہ وار علمی و تحقیقی مضامین کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری انجام دیتی ہے، دارالعلوم دیوبند کے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی جو چیز سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہی دیواری پرچے ہیں، جو پچاسوں کی تعداد میں سلیقے کے ساتھ دیواروں پر آویزاں نظر آتے ہیں۔ اور اسی طرح کے جداری مجلّے تقریباً ہر مدرسہ میں آویزاں مل جائیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ مدارس کا مکمل نصاب عربی زبان میں ہے، مگر عربی سے زیادہ اردو مجلّے شائع ہوتے ہیں اور عربی سے زیادہ اردو میں تقریریں کرائی جاتی ہیں۔

(۳) اردو لائبریری طلبہ کے ذوق اور تعلیم وتربیت کی مناسبت سے اردو زبان وادب کی کتابیں عاریۃً فراہم کرتی ہے، جن سے وہ اپنی تقریر وتحریر کی تیاری میں مدد لیتے ہیں۔

(۴) اردو مقالہ نگاری کا مسابقہ سال میں کئی مرتبہ کرایا جاتا ہے، جس کے عنوانات اور صفحات متعین ہوتے ہیں اور بحث وتحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے لئے قدیم سرمایہ سے استناد کو شرط قرار دیا جاتا ہے۔

(۵) اردو بیت بازی کا پروگرام بھی منعقد ہوتا ہے جس میں شرکاء معیاری اشعار پیش کرتے ہیں، نگراں اساتذہ کو جن اشعار پر شبہ ہوتا ہے ان کی تحقیق کرائی جاتی ہے، پھر فاتح اور مفتوح کا اعلان کیا جاتا ہے۔

ان تمام پروگراموں میں شریک طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے سالانہ انعامی جلسہ کیا جاتا ہے اور دینیات کے ساتھ ساتھ، اردو زبان وادب کی کتابیں انعام کے طور پر دی جاتی ہیں۔

مدارس سے شائع ہونے والے اردو رسائل وجرائد: مدارس سے معتد بہ تعداد میں وقیع اردو رسائل وجرائد نکلتے ہیں۔ ان رسائل وجرائد میں اہل قلم علماء اور طلبہ کے قیمتی مضامین اور تحقیقی مقالات کے علاوہ، حالات حاضرہ پر تجزیاتی اداریے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند نامور رسالوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض وہ رسائل بھی ہیں جو مدارس سے شائع نہیں ہوتے۔

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ ترجمان دیوبند، ندائے دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور، پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنو، ندائے شاہی مرادآباد، ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دہلی، ماہنامہ الفرقان لکھنو، ماہنامہ ضیاء الاسلام اعظم گڑھ، ماہنامہ صدائے حق گنگوہ، ماہنامہ شاہراہ علم اکل کوا، ماہنامہ ارمغان پھلت مظفر نگر، ماہنامہ پیام رحمانیہ حیدرآباد، الفرقان لکھنو، صوت الامۃ بنارس، محدث بنارس، خضر راہ الہ آباد، پیام عرفات بریلی، اعتدال ممبئ، الشارق مظفر پور اعظم گڑھ یوپی، نوائے علم کشمیر، نقیب پٹنہ، اللہ کی پکار دہلی، استدراک سنت کبیر نگر، اشرفیہ مبارکپور، الاحسان الہ آباد، الایمان، نقوش حیات سنت کبیر نگر، ماہنامہ ذکریٰ دہلی، ماہنامہ ندائے حرم لکھنو، صوت الاسلام ممبئ، جام نور دہلی۔ شیعہ مکتب فکر کے نامور رسائل میں سے تنظیم المکاتب لکھنو، اصلاح لکھنو، مصباح بنگلور، سفینہ سری نگر وغیرہ۔

مدارس اور صحافت: موجودہ عہد مواصلاتی ترقی کا ہے۔ آج اردو میڈیا میں اردو کے طلبہ کے لیے بہت سی گنجائشیں پیدا ہوئی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو شعبے صحافت اور ماس میڈیا کے کئی

کورس چلا رہے ہیں۔ مدارس میں یہ شعبہ تو قائم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اپنی محنت کے بل بوتے پر فارغین مدارس اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں، ایسے افراد کی ایک فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' ہے، جہاں منتخب فضلاء کو اردو صحافت اور انشاء پردازی کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے، اور اردو زبان وادب کے موضوع پر تحقیقی مقالات لکھوائے جاتے ہیں۔ یہاں سے فیض یافتہ فضلاء آج ملک کے کئی نامور اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی اردو خدمات: دارالعلوم دیوبند برصغیر ہندوپاک میں ام المدارس کا درجہ رکھتا ہے اور اسے از ہر ہند بھی کہا جاتا ہے، دارالعلوم دیوبند سرزمین ہند کے لئے ایک تاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دارالعلوم کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا انیس الاسلام قاسمی فرماتے ہیں:

> سواسو سالہ طویل وقت میں دارالعلوم نے اردو ادب کی ایک وقیع اور پروقار خدمات انجام دی، اس میں شعروشاعری بھی ہے، انشاء ونثر نگاری بھی، تصنیف وتالیف بھی اور خطابت بھی، عربی کتابوں کا ترجمہ بھی، اور ماہانہ وہفتہ وار اخبار ورسائل بھی، مطالعہ بھی اور اشاعت کے انتظامات بھی [۴]۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی دارالعلوم کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے میں سب سے مؤثر اور پائیدار ذریعہ تحریر ہے، فرزندانِ دارالعلوم نے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، علمائے دیوبند کا تصنیفی سرمایہ، جو تعداد میں دسیوں ہزار کتابوں پر مشتمل ہے ان کی صلاحیت تحریر کا مظہر ہے، صحافت (ادب) میں علمائے دارالعلوم کے کارناموں سے ایک تاریخ مرتب ہوسکتی ہے [۵]۔

شاعری اردو ادب کا ایک خاص فن ہے، اس میں بھی فضلاء مدارس کے کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ علمائے دیوبند کی شاعری کا محور، خالص دین ومذہب اور اردو زبان وادب کا فروغ رہا ہے۔ علمائے دیوبند نے شعر کو اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ جن علماء کو یہ ذوق فطرۃً ودیعت ہوا تھا ان کی فکر رسا نے خاص خاص حالات اور خاص خاص موقعوں پر قصیدے، نظمیں اور غزلیں موزوں کیں۔

۴۔ روزنامہ الجمعیۃ دہلی، دارالعلوم نمبر، ۲۶ / مارچ ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۰

۵۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی سوانح علمائے دیوبند، نواز پبلی کیشنز، دیوبند، ۲۰۰۰ء ص ۸۸

قاری طیب صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں: ''نہ میں شاعر ہوں اور نہ شعرگوئی اپنا مشغلہ لیکن جذبات جب ابھر کر منصۂ شہود پر آنے کے متقاضی بن جاتے ہیں تو ان کے لئے فن شاعری نہ شرط ہوتی ہے، نہ وہ اس کے پابند ہوتے ہیں۔''[۶]

مولانا محمد میاں صاحبؒ نے اپنی مشہور تصنیف ''علمائے حق'' جلد اوّل میں، تعلیمی اور سیاسی ماحول کے لحاظ سے علمائے دیوبند کے چند دور قرار دیے ہیں، ہم ادبی نقطۂ نظر سے ہر ایک دور پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر ایک دور اپنی آغوش میں اردو کے بہترین ادیب، خطیب اور شاعر لیے ہوئے ہے۔ علماء دیوبند کے انہیں ادباء اور شعراء میں سے چند کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ: خدا نے ان کو ایک بڑے عالم، عظیم داعی اور بے باک مناظر کے ساتھ ساتھ فطری شاعر بھی بنایا تھا، بچپن ہی میں آپ کو یہ دولت ودیعت کردی گئی تھی۔

حضرت مولانا یعقوبؒ: جامع العلوم والفنون اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے وہیں اپنے جذبات کو شعروسخن کے زیور سے آراستہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے، ''گمنام'' تخلص تھا، انہوں نے دہلی میں بزمانہ طالب علمی غالب، مومن، ذوق، صہبائی اور آزردہ جیسے یگانہ روزگار شعراء کو دیکھا تھا اور ان کی مجالس سخن کے ہنگاموں سے ان کے کان آشنا تھے، مولانا کا فارسی اور اردو کلام ''بیاض یعقوبی'' میں درج ہے، اشعار میں قدرت کلام کے ساتھ سوز وگداز اور درد واثر پایا جاتا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ: شیخ الہند کی ذات گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، تفسیر، حدیث، فقہ کے سرمائے میں اردو شاعری کا بھی ایک ذخیرہ ان کی یادگار ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ: چھوٹی بڑی ۷۷ ۸ کتابیں مولانا کے قلم سے نکلیں اور مقبولِ عام وخاص ہوئیں۔ تمام کتابوں میں ''بیان القرآن''، بوستانِ اردو کی عظیم ادبی شاہکار ہے[۷]۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ: عربی، فارسی، اردو کے بہترین شاعر تھے، مولانا کے صاحبزادے علامہ انظر شاہ کشمیری لکھتے ہیں ''آپ نے پندرہ ہزار اشعار کہے ہیں، جن میں سے گیارہ سو پچپن عربی میں ہیں''[۸]۔

۶۔ سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند، المیز ان، لاہور، ۲۰۰۵ء ج ۱ص ۳۵

۷۔ مولانا اسیر ادروی، کاروان رفتہ، دارالمؤلفین دیوبند، ۱۹۹۴ء، ص ۳۴

۸۔ سید انظر شاہ کشمیری، نقش دوام، شاہ بک ڈپو دیوبند، ص ۱۵۲

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ: ایک عالم متبحر اور عربی، اردو کے بہترین ادیب تھے، اپنے دور کے اہل قلم میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے دو مجلّے ''القاسم'' اور ''الرشید'' ہیں، ان ہی کی ادارت میں منظر عام پر آتے تھے اور دونوں علمی حلقوں میں مقبول تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ: یگانہ طرز تحریر اور شاندار ادیب تھے، نثر میں ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد تھے، الفاظ اور تراکیب کے حسن اور اندازِ بیان سے عبارت میں ایک مخصوص رنگ جھلکتا ہے، اردو کے ممتاز ادیب اور سحر البیان خطیب تھے [9]۔

مفتی شفیعؒ دیوبندی: مفتی اعظم اور مایہ ناز مصنف ہیں، ان کی سب سے شاہکار تصنیف ''معارف القرآن'' ہے، ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان سے ہر ہفتہ معارف القرآن کے اجزاء نشر کئے جاتے تھے، ان کا ادبی ذوق بھی ان کی تحریر سے نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ ان کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا، اردو، عربی اور فارسی میں قصائد، مرثیوں اور متعدد نظموں کا مجموعہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

مولانا اعزاز علیؒ امروہوی: دارالعلوم دیوبند کے ممتاز عالم مولانا اعزاز علی امروہوی کا ادب و شاعری سے بڑا گہرا رشتہ ہے، نظم و نثر دونوں میدانوں میں مولانا کی الگ چھاپ اور مضبوط گرفت ہے۔ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

> حضرت شیخ الادب کو جس طرح عربی نظم و نثر پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح وہ اردو نظم و نثر میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، اردو نثر میں ان کا ایک خاص انداز تھا۔ [10]

مولانا نسیم احمد فریدیؒ: دارالعلوم دیوبند کے صاحب طرز ادیبوں، ممتاز شاعروں میں مولانا نسیم احمد فریدیؒ کا بھی نام لیا جاتا ہے، انہوں نے کئی درجن کتابوں اور سینکڑوں مضامین کے ذریعے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کے اندر شعر گوئی کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ: مولانا فطری شاعر اور مستند سخنور تھے۔ بقول مولانا سالم قاسمی فرماتے ہیں آپ کی شاعری، شوقِ شاعری کے بجائے واقعات و حادثات پر ذہنی تاثر، حقیقی جزئیات اور متبادر ذہنی پر مبنی ہے۔ آپ کے کلام کے مجموعہ کا نام ''عرفان عارف'' ہے جس میں اردو، فارسی اور عربی کے

۹۔ عبداللہ عثمانی، چند مشاہیر، الحیاء پبلی کیشنز، دیوبند، ص ۶۹

۱۰۔ سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، المیز ان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ج ۲، ص ۵۹

کلام کو جمع کر دیا گیا ہے۔

مولانا اسلم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت (حکیم الاسلام) کا صنفِ شعر سے دلچسپی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے جاری تھا اور اب تک نظموں کا ایک معقول ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، جو ''عرفانِ عارف'' کی زینت ہے[11]۔

مولانا حامد الانصاری غازیؒ: وہ ایک عالم، محقق، ادیب، صحافی، شاعر، انشا پرداز، ہر میدان میں ممتاز تھے، ان کے قلم کی روانی دیدنی تھی۔ اردو زبان کے صاحب طرز ادیب اور ممتاز صحافی اور مقرر تھے، الجمعیۃ دہلی، مدینہ بجنور اور جمہوریت ممبئی، وغیرہ اخبارات کے مدیر مسئول رہ چکے تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰنؒ عثمانی: ان کے تعارف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ندوۃ المصنّفین جیسے عظیم ادارے کے بانی ہیں۔ بقول علامہ انظر شاہ صاحب اپنے خاص سلیقہ، قرینہ، بالغ شعور، بھرپور تندہی سے اس ادارے کو وہ حیثیت دی کہ دیوبند اس پر فخر کر سکتا ہے[12]۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ: قیمتی تصانیف، بے شمار علمی خدمات، تدریسی خصوصیات، اعتدال فکر، پاکیزگی مذاق، علوم حدیث وقرآن اور ان سے متعلقہ مضامین کے علاوہ عصری معلومات اور دورِ حاضر کی علمی تحقیقات کے حوالے سے ان کا مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونیوالے رسالے ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے معاون مدیر رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرز نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کی تحریر میں والہانہ اسلوب پایا جاتا ہے۔

مولانا امین الرحمٰن عامر عثمانیؒ: دارالعلوم دیوبند نے اپنی ادبی، صحافتی سفر میں لاتعداد افراد پیدا کیے، اسی گلشنِ ادب وصحافت میں ایک شجرِ علم وادب، صحافت ونقد مولانا عامر عثمانیؒ ہیں، جن کی ذات محتاج تعارف نہیں، وہ اپنے وقت کے امام صحافت، بے باک مبصر، لاجواب شاعر اور صحت مند ناقد

۱۱۔ ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۱۲، ج ۹۳، ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۹ء، مضمون: محمد مزمل، اردو ادب کے ارتقاء میں علماء دیوبند کا کردار ہفت روزہ اشاعت حق، ص ۲۷

۱۲۔ سید انظر شاہ کشمیری، نقش دوام، شاہ بک ڈپو دیوبند، ص ۷۶، مولانا اسیر ادروی، کاروان رفتہ، دارالمؤلفین دیوبند، ۱۹۹۴ء، ص ۸۱

تھے۔شعری،ادبی،تحقیقی ذوق فطری تھا،نیز برجستگی،متانت،سنجیدگی ان کو ورثہ میں ملی تھی،زبان وادب کی ہرصنف پران کی گرفت تھی۔ماہنامہ تجلی کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جو۱۹۴۹ء سے۱۹۷۵ء (مولانا کی وفات) تک بلا انقطاع شائع ہوتا رہا۔اس رسالے نے علمی وادبی دنیا میں بہت کم مدت میں شہرت حاصل کی۔منظرعام پرآتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔اہل علم صاحب ذوق شدت سے انتظار کرتے تھے۔

مولانا احسان اللہ تاجورؒ: مولانا تاجورؒ نے زمانہ طالب علمی ہی میں شعر کہنا شروع کردیا تھادارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ لاہور چلے گئے،''رسالہ مخزن'' اور''ہمایوں'' کی ادارت میں شریک رہے، ''انجمن ارباب ادب'' قائم کی جس کے اہتمام میں جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے،''اردو مرکز'' کے نام سے تصنیف وتالیف کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں مولانا تاجور کی زیر نگرانی اصغر گونڈوی،گویا جہان آبادی،مجنوں گورکھپوری،جگر مرادآبادی،اختر شیرانی اور طالب میرٹھی جیسے باکمال شعراء نے اردو کے مشہور نثر نگاروں اور شعراء کے کلام کا انتخاب کئی جلدوں میں ترتیب دیا۔

مولانا تاجوران چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کردی مگر پھر بھی ادبی دنیا کے لیے اجنبی ٹھہرے،تاریخ لکھنے والوں نے بھی انہیں بھلادیا،صرف خاصانِ ادب ہی ان سے واقف ہیں۔ن،م،راشد،اختر شیرانی،احسان دانش،قیوم نظر،جگن ناتھ آزاد کو کون نہیں جانتا،مگر واقف نہیں تو صرف ان سے جنھوں نے ان لوگوں کو جوہرِ قابل بنایا[۱۳]۔

ان کی ادبی خدمات کو بھلا دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ان کی ادبیت اور شعریت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ خود حکومت نے ان کو شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ان کے علاوہ دیوبند کے جن ادباء نے اپنے قلم کی روانی و برجستگی سے گیسوئے اردو کو سنوار کر اس کے حسن میں اضافہ کیا،ان میں مولانا ذوالفقارعلی،مولانا احمد صاحب،مولانا حسین احمد مدنی،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی،مولانا محمد میاں صاحب،مولانا قاضی اطہر مبارکپوری،مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی،مولانا کفیل الرحمٰن علوی،علامہ انظر شاہ کشمیری،مولانا منظور نعمانی، مولانا رضوان القاسمی،قاضی مجاہدالاسلام قاسمی،مولانا افضال الحق قاسمی،مولانا اسرارالحق قاسمی،مولانا سالم قاسمی وغیرہم اپنے وقت

۱۳۔ حقانی القاسمی،دارالعلوم دیوبند،ادبی شناخت نامہ،تنظیم علماءحق،دہلی،۲۰۰۶ء،ص۱۳۱

کے یگانۂ روزگار اور یکتائے زمانہ گلشن ادب کے خوبصورت، جاذب نظر اور خوشبودار پھول تھے۔اسی طرح مولانا نظام الدین اسیرادروی، مولانا نور عالم خلیل امینی، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، مولانا شاہین جمالی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی سلمان منصور پوری، مولانا سالم جامعی، مولانا ندیم الواجدی، مولانا حقانی القاسمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو ادب کے ارتقاء اور بقا میں مدارس کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے۔آج اردو کے ان بیش بہالعل وگوہر کی خدمات کو سامنے لانے اوران کے نام وکام کواجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔

خلاصہ کلام: یہ حقیقت ہے کہ حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے خاطر خواہ پیش قدمی نہیں کی جس کی وجہ سے اردو زبوں حالی کی شکار ہوگئی۔حکومتی تعصب کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اتر پردیش جیسا عظیم صوبہ جس میں اردو میڈیم کا سرکاری سطح پر پرائمری سے انٹر تک کوئی بھی اسکول یا کالج نہیں ہے حالاں کہ دوسرے صوبوں میں اردو میڈیم اسکول اور کالج پائے جاتے ہیں۔

حکومتِ ہند نے اردو میڈیم اساتذہ کی تدریسی تربیت کے لیے تین ادارے تین مختلف یونیورسٹیوں جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی میں قائم کیے۔لیکن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں لازمی اردو بھی بڑی حد تک ایک سیاسی نعرہ ہی ہے۔پچھلی ایک دہائی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی نے اردو میڈیم کی تعلیم میں اچھی خاصی پیش رفت کی ہے۔

اردو کے مقابلے میں درجنوں زبانیں اپنی مخصوص جغرافیائی پہچان کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کی پشت پناہی سے تعلیم وتدریس میں اپنا مناسب مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

آزادی کے بعد ملک کی سرکاری زبان ہندی ہوگئی اور سرکاری اداروں میں اردو کو نظر انداز کیا گیا۔ چند سرکاری اسکولوں میں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو بھی شامل ہے۔

ہندوستان کے کسی صوبے کی سرکاری زبان اردو نہیں ہے ہاں دوسرے یا تیسرے درجے پر اس کو رکھا گیا ہے۔

اس طرح اگر دیکھا جائے اور یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آزادی کے بعد اردو اگر زندہ رہی تو انھیں مدارس عربیہ کی بدولت اور جو بھی ملک میں اردو کا چلن اور رواج ہے یا جس زبان و بیان کا

استعمال ہو رہا ہے وہ مدارس عربیہ کی دین ہے۔ اگر ان مدارس عربیہ کا وجود نہ ہوتا اور اکابرین علماء کرام مدارس عربیہ کی طرف توجہ نہ فرماتے تو شاید اس ملک سے زبان اردو کا اور بھی برا حال ہو گیا ہوتا۔

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد ہمارے ملک میں اردو اپنوں اور غیروں کے ظلم وستم کی شکار ہو گئی، گزشتہ سات دہائیوں میں ترقی کی منزلیں طے کرنے کی جگہ محدود ہوتی اور سمٹتی چلی گئی اور مسلسل زوال کی طرف جارہی ہے، ایسے حالات میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے جدوجہد کریں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اردو زبان علوم سے بالکل عاری ہے۔ اردو کی ترقی کے لئے سب سے اہم اور ضروری چیز اس کی تعلیم ہے، اگر کسی زبان کی تعلیم کا نظام درہم برہم ہو جائے تو پھر اسے تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اسکولی سطح پر اردو کی تدریس مؤثر ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ تدریسی مواد اردو میں فراہم کیا جائے، اکثر اسکولوں میں اردو زبان کی کتاب چھوڑ کر باقی درسی مضامین اردو میں ناپید ہیں، مثلاً: پرائمری اور ثانوی سطح پر ماحولیات، سائنس، علم سماجیات، علم الحساب، معاشیات علم طبیعیات اور علم کیمیا وغیرہ کی کتابیں اردو میں دستیاب ہی نہیں، پڑھنے اور پڑھانے کی بات تو دور۔ ان مضامین کی کتابیں سرکاری سطح پر شائع ہی نہیں کی جاتیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی زبان کی بنیادیں اس وقت تک مضبوط و مستحکم نہیں کہی جاسکتیں جب تک علوم اس میں منتقل نہ ہو جائیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے۔

اردو میڈیم تعلیم پر جو عمومی اعتراضات ہیں، وہ یہ کہ اردو میں تمام مضامین کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں جب کہ اگر ہم مدارس عربیہ کے نصاب کی تمام کتابیں اردو زبان میں دستیاب ہیں، زیر درس عربی کتابوں کی شرحیں اردو میں موجود ہیں۔

یاد رہے کسی زبان کو فروغ دینے میں صرف سرکاری سہولیات کی ضرورت نہیں ہوتی، زبان کو پڑھنے پڑھانے والے چاہیں تو اپنے بل بوتے پر اس کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

آج کوئی ایسا سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ نہیں ہے جو اردو کے مسائل کے بارے میں سو فی صد سنجیدہ ہو۔ لہذا اب اردو داں طبقہ کو چاہیے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنی مادری زبان کے تمام مسائل کو وہ

حل کرنے کے لیے فکر کریں۔

اردو زبان کے تئیں مدارس کی ان خدمات کا اعتراف بھی ہونا چاہیے اور اظہار بھی، ارباب مدارس کو خراج تحسین بھی پیش کرنا چاہیے اور جذباتِ تشکر و امتنان بھی اور اردو زبان و ادب کی دنیا میں ان کا پرزور استقبال بھی ہونا چاہیے اور شاندار حوصلہ افزائی بھی، ان ارباب اردو کی طرف سے جو سرکاری سطح پر اردو اور اہل اردو کی خدمت پر مامور ہیں۔

اخبار علمیہ

جدہ میں ۲۵ ہزار نوادرات کی دریافت

سعودی عرب میں آثار قدیمہ کی دریافت کی ایک مہم میں صرف جدہ شہر کے آس پاس صدیوں پرانے ہزاروں نوادر دستیاب ہوئے ہیں۔ زیر زمین دریافت کا یہ سلسلہ نومبر ۲۰۲۰ء میں شروع ہوا۔ خبروں کے مطابق ۱۱۴۰۵ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے، جانوروں کی ۱۱۳۶۰ ہڈیاں، ۱۷۳۰ خول، ۷۸۱ شیشے اور ۷۱ دھاتی نمونے اور ۶۸۵ تعمیری چیزیں مل چکی ہیں۔ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں اور سنگ مرمر پتھروں والے مزاروں اور ان کے کتبات اور تختیاں بھی ہیں جو آٹھویں نویں صدی عیسوی کے زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں۔ ماہرین کے مطالعہ و تحقیق نے ان دریافتوں کو بہت قیمتی بتایا ہے۔ یہ آثار قدیمہ جن ۴ مقامات پر ملے ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ مسجد عثمان بن عفانؓ، قلعہ شونہ، خندق شرقی اور سور شمالی ہیں۔ مسجد عثمانؓ بن عفان کے آثار کی قدامت کا اندازہ پہلی اور دوسری صدی ہجری سے کیا گیا ہے۔ نوادر میں چینی مٹی کے برتن کے ٹکڑے بھی ہیں۔ خیال ہے کہ یہ چینی صوبہ جیانگ سی میں سولہویں سے انیسویں صدی تک کے عرصہ میں بنائے گئے۔ بعض برتنوں کا تعلق عہد عباسی سے بھی بتایا گیا ہے۔ سعودی وزارت سیاحت نے بتایا کہ اس وقت جس علاقہ کو جدہ کہا جاتا ہے وہاں حجری عہد میں آبادی تھی۔ جیسا کہ شہر کے مشرقی علاقہ میں قوم ثمود کے آثار و کتبات موجود ہیں۔ تقریباً ۳ ہزار سال قبل شکاریوں کا ایک قافلہ بحر احمر سے ہوتا ہوا یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ کچھ مؤرخین اس کو بنی قضاعہ بتاتے ہیں جنہوں نے ۱۱۵ قبل مسیح میں یمن میں سد مآرب کی تباہی کے بعد یہاں بود و باش اختیار کی تھی۔ عربی میں جدہ بضم ج ساحل سمندر کو کہتے ہیں۔ اس کو جُدہ بھی کہا گیا جب کہ جیم پر زبر کے ساتھ جَدہ کا مطلب دادی یا نانی ہوتا ہے اور اس سے ام البشر حواء علیہا السلام کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے جو اسی شہر میں مدفون ہیں۔ اب جدہ ہی عام تلفظ ہے۔ ظہور اسلام کے ساتھ جدہ کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ باب الکعبہ کی حیثیت نے اس شہر کی اہمیت اور عظمت میں بڑا اضافہ کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو بندرگاہ کی حیثیت سے نئی پہچان دی۔ جدہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ مقدسی بشاری سے آج تک سیاح اس کا ذکر بڑے لطف سے کرتے ہیں۔ عہد ممالیک میں ایک منصوبہ بنا تھا کہ جدہ کے اطراف میں دیواریں اٹھا دی جائیں کہ یہ دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رہے۔

ک، ص اصلاحی

تبصرۂ کتب

امتیاز وحید، عمیر منظر: **اشاریہ فارغین جامعۃ الفلاح کی ادبی خدمات**، ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۲۴ء، صفحات ۲۴۰، آئی ایس بی این: 978-81-9444609-8-5 ۔ **قیمت**: ۲۰۰/روپئے۔ ایمیل ناشر: idaraeilmiya@gmail.com

جامعۃ الفلاح شہر اعظم گڑھ کے مضافاتی قصبہ بلریا گنج میں واقع ایک اہم دینی مدرسہ ہے جس میں عربی درجات، فضیلت اور تخصص تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ نسبتاً نیا ہونے کے باوجود ہندوستان کے دینی مدارس میں اس کا خاص مقام ہے۔ یہ ادارہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا تھا۔ درجہ پنجم تک یہ ادارہ ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے پہلے سے کام کر رہا تھا۔ جماعت اسلامی کے افراد کی توجہ سے اس میں عربی درجات شروع ہوئے اور اگلے سالوں میں بہت ترقی ہوئی۔ عملی طور پر یہ جماعت اسلامی ہند کا ایک ادارہ ہے۔ اس عرصے میں اس ادارے سے ہزاروں لوگ فارغ ہوئے اور بعض نے علم وادب اور تدریس کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے فارغین ہندوستان، خلیج اور مغربی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اس کتاب میں ممتاز فضلاء جامعۃ الفلاح کا تعارف کرایا گیا ہے جو علم وادب کی دنیا میں مقام رکھتے ہیں اور جن کی تصنیفات مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں یا جو مختلف اہم اداروں اور یونیورسٹیوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس کتاب میں جامعۃ الفلاح کا مختصر تعارف کرانے کے بعد کچھ اہم فضلاء کا تعارف کرایا گیا ہے اور پھر ان کی تصنیفات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے بہت سے نام سامنے آئے جن کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کے فارغ ہیں اور اب اس کتاب سے معلوم ہوا کہ وہ جامعۃ الفلاح کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ اپنے نوع کی ایک اہم تصنیف ہے۔ امید ہے کہ دوسرے اہم مدارس بھی اپنے فضلاء کے بارے میں اس طرح کی تصنیفات سامنے لائیں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کی کیا تصنیفات ہیں اور وہ کہاں خدمات انجام دے رہے ہیں یا دے چکے ہیں۔

(ظفر الاسلام خان)

پروفیسر حکیم جاوید احمد لاری (جمع و تدوین): **مولانا محبّ اللہ ندوی حیات و خدمات**، مرتب ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۶۷۰، قیمت ۳۰۰/روپے، پتہ: لاری منزل، پلاٹ نمبر ۶ گلاب پارک، مالے گاؤں، ناسک ۴۲۳۲۰۳، موبائل نمبر ۹۴۲۰۹۳۲۲۱۳، سن اشاعت ۲۰۲۳ء۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ میں جہاں اصلاح نصاب اوراس کے نتیجے میں ہوش مند علماء اور اردو زبان وادب کو بلند پایہ تصنیفات وتالیفات سے معمور کر دینے والے اصحاب قلم اور جدید تقاضوں کے پیش نظر متعدد تحریکوں کے وجود اور ان کے میدان عمل کا ذکر نمایاں طور سے کیا جاتا ہے، وہیں دارالعلوم کے انتظام وانصرام سے تعلق رکھنے والوں کو اس شان سے یاد نہیں کیا گیا جس کے وہ واقعی مستحق تھے، مولانا محمد عمران خان کا دور انتظام عرصہ تک لوگوں کی یادداشتوں کا حصہ رہا لیکن مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا ابوالعرفان خان ندوی جیسے اصحاب اہتمام کے متعلق معلومات پردۂ خفا ہی میں رہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسند اہتمام کسی بڑے ادارے کی ذمہ داریوں سے کہیں بڑی ذمہ داری کی ہمیشہ متقاضی رہی، اس کے لیے علمی قابلیت، معاملہ فہمی، انتظامی صلاحیت اور بروقت صحیح اور منصفانہ فیصلے لینے کی غیر معمولی قوت ارادی کی خوبیوں پر سب سے پہلے نظر کی جاتی رہی۔

یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان خوبیوں کا ایک خوبصورت پیکر مولانا محبّ اللہ لاری ندوی کی ذات والا صفات تھی۔ ندوہ کے علاوہ مسلم یونیورسٹی سے بھی فیض اٹھانے کی وجہ سے ایک اضافی جامعیت اور توازن کی صفت بھی ان میں کمال درجہ کی تھی، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک وہ اس ندوہ میں زیر تعلیم رہے جو گویا عہد زرّیں کی تصویر ہے جس دور کے اساتذہ اوراسی طرح تلامذہ ہی ندوہ کا اصل سرمایہ قرار پائے، اس دور کی یہ برکت ہی تھی کہ علی گڑھ سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد بھی لاری صاحب کو قریب سے دیکھنے والے ان کی علمی وصحافتی صلاحیتوں سے زیادہ ان کی زاہدانہ زندگی پر رشک کرتے تھے، ان کا تقوی ان کی کم سخنی اور بے نیازی اور زندگی کو سادگی سے پر معنی بنانے سے عبارت ہے، ندوہ کے عہدِ شباب میں دفتر اہتمام کو کسی گمنام بزرگ کی خانقاہ کا رنگ دینا آسان نہیں تھا لیکن مولانا محبّ اللہ لاری واقعی صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے معانی سے آگاہ تھے۔ ان کے دور میں ندوہ کی انتظامی دنیا میں بڑے سخت وقت بھی آئے لیکن مولانا کے عزم اور فیصلہ لینے کی طاقت نے ان کو

ہمیشہ سر بلند ہی رکھا۔ کبھی کبھی مولانا کو دیکھ کر نظام قدرت پر یقین بڑھ جاتا کہ آسمان اور زمین سب ہمہ وقت متحرک ہیں پھر بھی ان کی پہچان سکون وقرار کی ہے مولانا بھی بظاہر ہلچل سے دور ٹھہراؤ کی منزل میں نظر آتے لیکن نحیف ونزار جسم میں اللہ تعالیٰ نے کیا توانائی رکھی تھی کہ ان کی نظر اوران کا دماغ ہمیشہ حرکت میں رہتا، یہ ساری باتیں اس کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہیں۔ ضرورت تھی کہ ندوہ کے ایک نہایت سچے نمائندے کی زندگی پر نظر کی جائے اور یہ ان کے ذریعے ہو جوان کے معاصر تھے اور معاصروں سے زیادہ ان کے شاگرد اور تربیت یافتہ لوگ تھے، خدا کا شکر ہے کہ یہ فریضہ مولانا کے نواسے نے بطریق احسن ادا کیا قریب ۷۰۰ صفحات میں سینکڑوں مضامین کو یکجا کرنا اوران کو سلیقہ سے الگ الگ عنوانوں کے تحت پیش کرنا ،مولانا مرحوم کی بعض عربی اور اردو نگارشات اور خطوط کو جمع کرنا اوران کے انتقال کے بعد مدارس اور اخبارات کی تعزیتی تحریروں کو سمیٹنا کوئی معمولی بات نہیں، اس کا اندازہ لائق جامع ومدون کی روداد سے بھی ہوتا ہے، مضامین کے حصول کے لیے شاید ہی کسی اور نے پورے ملک کا کئی سالوں تک سفر کیا ہو لیکن اس محنت کا ثمرہ بھی ملا کہ ایک نہایت احترام اور تقلید کے لائق زندگی سے رشتہ جوڑنے کا ذریعہ فراہم ہوگیا، مولانا مرحوم کے عہد اہتمام میں بعض طلبہ کی وجہ سے اسٹرائک کے نام پر طوفان بے تمیزی بھی سامنے آیا، اس کی روداد بھی الگ ضمیمے کے طور پر دے دی گئی ہے، یہ اس لحاظ سے قیمتی ہے کہ یہ اس موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتی ہے، کتاب کی دلکشی اور جاذبیت میں جامع اور مدون کے علاوہ پروفیسر جمشید ندوی کی تصنیفی و تالیفی لیاقت بھی خوب ظاہر ہو کر رہی۔ تحسین وتبریک میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ (عمیر الصدیق ندوی)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی: **فلسطین قرض اور فرض**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۷۶، قیمت ۱۸۰؍روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، ہدایت پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز ایف ۱۵۵، فلیٹ نمبر ۲۰۴، ہدایت اپارٹمنٹ، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵، موبائل: ۹۸۹۱۰۵۱۶۷۶، ای میل hidayatbooks@gmail.com

فلسطین، بنی اسرائیل، یہود، بیت المقدس، اسلام، مسجد اقصیٰ، قبضہ، دستبرداری، جنگ، صلح انسانوں کے ساتھ ساتھ انصاف کا قتل اور یہ سب صدیوں کے تسلسل اور استمرار کے ساتھ شاید ہی دنیا کے کسی خطے کی تاریخ کے اتنے عنوانات دورِ زماں نے نسل در نسل پیش کیے ہوں۔

لیکن فلسطین اور اسرائیل کا جو قضیہ یورپ کی سرمایہ داری، استعمار اور ساری دنیا کو غلام بنانے کی

ذہنیت نے قریب ایک صدی قبل پیدا کیا وہ اس خطے کی تاریخ کا سب سے تاریک اور شیطانی مکر وفریب کا بدترین نمونہ کہا جائے گا، خصوصاً غزہ کے نام پر موجودہ شیطانی منظرنامہ نے شیطانی اور طاغوتی عفریتوں کی جو تصویریں دکھائی ہیں ان کو بیان کرنے سے زبان اور قلم دونوں عاجز نظر آتے ہیں، ایک طرف تو یہ حقیقت ہے دوسری جانب اپنوں کی بے حسی اور سردمہری بلکہ اس کتاب کے لائق مصنف کی زبان میں بے غیرتی نے زخموں کو ناسور بنا کر رکھ دیا ہے، یہ سمجھنے کی ضرورت بھی کم ہی محسوس کی جاتی ہے کہ فلسطین کا قضیہ محض دو قوموں یا ایک ہی زمین کے دو حصوں کا تنازعہ نہیں ہے، یہ حق اور باطل کی جنگ ہے دوسرے الفاظ میں یہ پوری امت کا قضیہ ہے اور اس کو اسی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے موجودہ عالمی سیاست جو حق و باطل کے دو اصل محاذوں سے بے نیاز ہو کر علاقہ، زبان، تہذیب اور علوم کی قلب ماہیت کی بنیاد پر ہے اس کی فریب کاریوں بلکہ وقت کے فرعونوں کے ساحروں کے سحر عظیم نے ظالموں کی صف میں مظلوموں کو بھی لا کھڑا کر دیا ہے، اسی احساس نے مصنف کو اس قضیہ کے تمام ابعاد و جہات کو واضح کرنے اور مسئلہ کی تہہ تک جانے کے لیے آمادہ کیا، مصنف ابھی تازہ دم ہیں، جوش بھی وافر ہے، غیرت وحمیت کی نعمت بھی خوب ملی ہے، اس لیے ان کے جذبات میں گرمی بھی ہے اور کہیں کہیں حالات کے لیے تلخی بھی ہے، قلم سیال ہے اس لیے جذبات بھی طوفان اقصیٰ کے لیے جواز رکھتے ہیں لیکن یہ کتاب محض جذبات کا بے اختیارانہ اظہار ہی نہیں اس میں بیت المقدس کی تاریخی و دینی حیثیت معرکہ ہائے قدس کی حقیقتیں، یہود اور مسلمانوں کی جنگوں کا اصل سبب جیسے موضوعات پر اہم معلومات آگئی ہیں ضمناً ہی سہی لیکن اصلاً روح جہاد کے احیاء کی وہ بات بھی آگئی ہے جو قریب ایک صدی سے مرعوب ذہنیت کو بڑی ناگوار گزرتی رہی ہے، مضامین کی تیاری میں علامہ یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر راغب السرجانی کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، زندہ اور حساس موضوعات پر کتابیں اب کم ہی آتی ہیں یہ کتاب بروقت ہے اس لیے اور بھی قدر کے لائق ہے۔

(ع۔ص)

ڈاکٹر دبیر احمد: **ظفر اوگانوی بیچ کا ورق کے تناظر میں**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۴۴، قیمت ۴۰۰/ روپے، پتہ: مدیحہ پبلیکیشنز، ۴۴ بی، کارل مارکس سرانی، کولکاتہ -۲۳، سن اشاعت ۲۰۲۲ء، موبائل: ۹۴۳۳۰۷۸۸۰۲

اردو ناولوں اور افسانوں کی دنیا میں ظفر اوگانوی کا نام اردو کے عام قاری کے لیے کچھ غیر معروف سا ہو سکتا ہے لیکن بہار کے مردم خیز خطہ کی ایک نیک نام بستی کی وطنی نسبت رکھنے والے ظفر صاحب مدھیہ پردیش کی ایک اور قدیم مسلم افسانوی بستی سرونج میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد سید فصیح الدین نے سرونج کے علاقے میں علم دین کی شمع روشن کی جس کی روشنی میں ظفر صاحب بھی حفظ قرآن اور عالمیت کے محراب و در سے گزرے، راہوں کے پیچ وخم میں الجھے تو پٹنہ یونیورسٹی میں نظر آئے۔ پروفیسر نجیب اشرف کا وجود ان کے لیے شجر سایہ دار بنا، اس طرح ان کی زندگی کسی کامیاب افسانے کی طرح واقعات کی رنگارنگی اور حالات کی بوقلمونی کی تصویر بن گئی، کتاب کے نام میں بیچ کا ورق شامل ہے حالاں کہ یہ افسانہ چوتھے پانچویں نمبر پر ہے ، مگر اس عنوان کو ترجیح دینے میں ہوسکتا ہے شاید یہی احساس ہو کہ خود ظفر صاحب کی زندگی ، بیچ کا ورق ہی تھی۔ اس پس منظر میں ان کی افسانہ نگاری حیرت کا سبب نہیں لیکن نامور افسانہ نگاروں میں انہوں نے خود کو جس طرح شامل کرایا اس کی کہانی خود ان کے افسانوں کے تجزیوں سے ظاہر ہوتی رہی، انٹرا موروس ، نیا آئینہ، نئی سڑک، اہرام ، نیا رنگ، بیچ کا ورق، قیادت، باولی اور ٹینک ، پہاڑ پر ایک حادثہ، کھوپڑیوں کے سوداگر اور ریس کے گھوڑے جیسے افسانوں کا حق تھا کہ ان کا تجزیہ اچھے نقادوں کی قسمت میں آئے، اس کتاب میں انہی افسانوں پر اردو ادب کے ممتاز نقادوں نے جس طرح تجزیہ کیا وہ اس صنف ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک خوبصورت تجزیہ ہے، ہم تو افسانوں کو افسانہ ہی سمجھتے ہیں، قدیم وجدید، ترقی پسند، رومانیت زدہ، تاریخی، معاشرتی حتی کہ دینی تقسیم سے آزاد ہ کر انسان کے اپنے داخلی احساسات جہاں کرب بھی ہو، حظ بھی ہو، درد والم بھی ہو اور آنکھوں میں لطف ولذت کی ناقابل بیان چمک بھی ہو، جہاں زندگی کی اصل تصویر کشی کی کوشش ہو، بس اسی کو افسانہ کہتے رہے، باقی شعور کو فن پر کیا فوقیت ہے؟ سماجی قدروں کو جمالیاتی قدروں پر ترجیح ہے یا نہیں یا پھر مواد اور ہیئت میں پہلے کس پر نگاہ کی جائے؟ عصری تخلیقی رویے رجحانات یہ سب نقادوں کے لیے ہیں، ہم تو انسان کے لامحدود احساسات کی کامیاب ترجمانی ہی کو افسانہ کی کامیابی سمجھتے ہیں ، کتاب کے محقق مرتب نے صحیح سوچا کہ ظفر اوگانوی کی کہانیاں وسیع تر کینوس ، ارتکاز ، اشارت، علامت اور تحریر کی خوبیوں کے باوجود کیوں ناسخن شناسی کا شکار ہوئی؟ شاید اسی خلش کو دور کرنے کے لیے یہ تجزیاتی تنقید پر مشتمل ایک ایسی کتاب بن گئی جس میں ایک انفرادیت ہے۔ بالکل ظفر اوگانوی کی افسانہ نگاری کی طرح۔ بجا طور پر کہا گیا کہ کارناموں کو تجزیے کے ساتھ پیش کرنا ایک اچھی ادبی کوشش ہے

دعووں کی کمی نہیں، لیکن دلائل کی کثرت ہو تو ہر بحث پر لطف بھی ہو جاتی ہے اور فکر انگیز بھی۔ (ع۔ص)

مولانا محمد صابر حسین ندوی، **صدائے فلسطین** : متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۲، **قیمت** ۳۰۰/ روپے، پتہ: المعہد الاسلامی، حیدرآباد اور جامعہ ضیاء العلوم، کنڈلور، کرناٹک وغیرہ، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، ای میل: mshusainnadwi@gmail.com

فلسطین اور غزہ کے موجودہ حالات نے عالمی ضمیر کو جس طرح آواز دی ہے اور خاص طور پر ملت اسلامیہ کی غیرت وحمیت کو للکارا ہے وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں، جنگیں اور قتل و غارت گری تو ہمیشہ وقت کی گردشوں سے فساد اور خونریزی کے اس اندیشہ کو واقعہ میں بدلتی رہیں جس نے ملکوتیوں کو بھی تخلیق انسانی کے رمز کو سمجھنے کے لیے بے چین کر دیا تھا لیکن غزہ کے چھوٹے سے خطے پر سفاکیت و بہیمیت کے پہاڑ جس طرح توڑے گئے، اس کا نظارہ شاید چشم فلک نے کبھی اس طرح نہیں کیا ہوگا۔

زیر نظر کتاب ایک نوجوان صاحب قلم کے ان مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو فلسطین کے تعلق سے لکھے گئے، یہ غالباً غزہ کے موجود نسل کش قتل عام سے پہلے کے ہیں لیکن اس میں قضیہ فلسطین کے متعلق تاریخ اور اسرائیل اور فلسطین کی مسلسل جنگ اور بیت المقدس اور عالم اسلام کے تعلق سے صرف تاریخی حقائق ہی کو پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ روح بھی سامنے آ گئی کہ اگر ایک مسلمان کی زندگی میں بیت المقدس اور فلسطین کی یادوں، محبتوں اور عظمتوں کا رس نہیں تو پھر اس کے لیے کیا خیر ہے؟ یہ امید کرنا بالکل درست ہے کہ اس قسم کے مضامین سے دبی ہوئی چنگاریاں متحرک و مشتعل ہوں گی۔ ایک عجمی نژاد دور افتادہ نوجوان کے بس میں اس سے زیادہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

مولانا سید رابع حسنی ندوی اور مولانا سعید الرحمٰن ندوی اور مولانا خالد سیف اللہ اور ڈاکٹر طارق ایوبی کی تحریروں سے اس کتاب کو اور بھی اعتبار حاصل ہوا ہے۔ (ع۔ص)

حضرت نذیر احمد رحمانی، ترتیب جدید مع اضافہ پروفیسر مقصود احمد: **تحفۃ المشتاقین (اضافہ شدہ جدید اشاعت)**، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد۔ صفحات: ۳۳۲۔ پتہ: مقصود احمد ۲۰۳ شفا کامپلکس تاندلجا روڈ، بڑودہ۔ ۳۹۰۰۲۰، گجرات انڈیا۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۴۰۳۳۰۱۷۔

صاحب تذکرہ حضرت نذیر احمد رحمانیؒ جائس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن اور پھر اعلیٰ تعلیم بریلی اور الٰہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت شاہ انعام الرحمٰن قدوسی سہارنپوریؒ سے بیعت ہوئے۔ تصوف ان کا خاص موضوع ہو گیا۔ کئی کتابیں اسی موضوع پر تیار کیں جیسے تحفۃ المشتاقین، تحفۃ الطالبین اور تحفۂ

جعفری وغیرہ۔ان میں تحفۃ المشتاقین پہلی بار ۱۹۵۵ء میں منظر عام پر آئی جس میں پانچ ابواب، ضمیمے اور حواشی کے ساتھ شامل ہوئے۔مرشد کی بعض تحریروں اور پھر بعض سلاسل صوفیہ اور ان کے وفیات و ارشادات مختلف ابواب میں پیش کیے گئے۔آخر میں ایک منظوم حصہ بھی ہے جو نعت و منقبت کے لیے ہے۔

کتاب کمیاب ہو چکی تھی اس لیے فاضل مرتب نے اس کی اشاعت جدید کا اہتمام اس طرح کیا کہ کتاب کا تعارف، صاحب کتاب کے حالات اور کچھ اور تحریروں کا اضافہ کر دیا۔ان میں مناقب خلفائے راشدین اور حضرت امام حسین اور بعض دعائیں، آداب صلوٰۃ، تدفین کی شرعی صورت، انبیائے کرامؑ کی حیات بعد الممات، فضائل صحابہ وغیرہ تحریریں آگئی ہیں۔ (کلیم صفات اصلاحی)

مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، **برصغیر ہند کے چند ممتاز مشائخ چشت:** کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۲۸، ملنے کا پتہ: بیت الحکمۃ کریم الدین پور گھوسی، مئو، یوپی۔ قیمت: درج نہیں۔سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔موبائل نمبر و ای میل: درج نہیں۔

ہندوستان میں اسلام کے پیغام اور اس کے لیے حضرات صوفیہ کے طرز اصلاح و تبلیغ کی اہمیت ظاہر ہے۔ بالخصوص مشائخ چشت کی روحانی و اصلاحی سرگرمیوں سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ بھری ہوئی ہے اور جس کی گواہی آج بھی ان صوفیائے کرام کی برکتوں اور ان کے اثرات سے ملتی ہے۔

فاضل مصنف کی شہرت تاریخ و تحقیق میں محنت اور دیدہ ریزی کی خوبیوں سے ہے۔مشائخ چشت سے ان کو خاص لگاؤ ہے۔اس لیے اس کتاب میں اور بھی تاثیر پیدا ہو سکتی ہے۔ممتاز مشائخ چشت سید محمد صغریٰ بلگرامی، شیخ جمال الدین ہانسوی، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی، شیخ زین الدین شیرازی، شیخ نور الحق قطب عالم، شیخ احمد عبدالحق نوشہ ردولوی، شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی، شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، شاہ نور محمد مہاروی اور سید محمد علی حسین اشرفی کے سوانحی حالات، تصنیفات، ملفوظات و اقوال، فضل و کمال، ورع و تقویٰ، ایثار و قربانی کے واقعات کو انہوں نے بڑی جامعیت سے یکجا کر دیا ہے۔مشائخ چشت پر کتابیں کثرت سے ہیں۔ایسے میں اس کتاب نے اپنی جانب توجہ مبذول کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہ اس طرح کہ تزکیۂ نفس و صفائے قلب کی حقیقت، مروجہ اذکار اور کرامات کا تذکرہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ تصوف کے دقیق مسائل و مصطلحات کو بہ آسانی سمجھایا گیا ہے۔ باقی صوفیہ حضرات کے تذکروں میں روایات کو بیان کرنے کا جو صدیوں پرانا انداز ہے اس سے یہ کتاب بھی جدا نہیں ہے۔ **(ک ص اصلاحی)**

غزل

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، ہمدرد نگر، بی، جمال پور۔علی گڑھ

جو چاہو بزمِ دل آباد کرنا
وفاؤں کو ہماری یاد کرنا

ہوئیں صدیاں ، سکھایا تھا ہمیں نے
دلوں کی بستیاں آباد کرنا

خود اپنے دل پہ رکھ کر ہاتھ سوچو!
تمہیں آیا کسی کو شاد کرنا ؟

ذرا سا سیکھ لو سچ بولنا بھی
ہمیں پھر شوق سے برباد کرنا

نصیحت سے کہاں ممکن ہے ناصح !
مداوائے دلِ ناشاد کرنا

مبارک باد اے حکّامِ دوراں
بہ جائے داد کے بیداد کرنا

سکھایا ہی نہیں آباء نے ہم کو
غلط باتوں کے اوپر صاد کرنا

مزاروں کو سجانے سے ہے بہتر
کسی مجبور کی امداد کرنا

رئیس اہل جہاں کچھ بھی کریں ، تم
بس اپنے رب سے ہی فریاد کرنا

☆

سانحۂ ارتحال ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

ظفر حجازی، پاکستان

بے ثبات اس دہر میں بادِ فنا کے زور سے
بجھ رہے ہیں رفتہ رفتہ علم کے روشن دیے
درد سے معمور دل، سینہ ہے غم سے داغ داغ
بجھ گیا ہے علم کا اک اور رخشندہ چراغ
آسمانِ علم و دانش کا جہانِ بے کراں
حضرتِ اقبال کے فکر و نظر کا ترجماں
حکمتِ مشرق، فنا فی الشاعرِ مشرق بھی تھا
صاحب فکر و بصیرت، فکر میں صادق بھی تھا
کر کے دکھلائی ہے اُس نے فکر کی تزئین بھی
اصل کا وہ ہاشمی یعنی رفیع الدین بھی
دودمانِ ہاشمی کا گوہرِ تابندہ تھا
لمحہ لمحہ دانشِ اقبال سے خورسندہ تھا
راہرو بھی تھا اگر وہ، صاحبِ منزل بھی تھا
ایک بحرِ علم، دانائے کفِ ساحل بھی تھا
صاحبِ علم و ہنر تھا، واقفِ حالات بھی
بے مثال و بے بدل ہیں اس کی تحقیقات بھی
تھا یقیناً بے مثیل استاد بھی، نقاد بھی
اور تحقیقِ ادب کا اک جہاں آباد بھی
تھا قلم میں تیز تر، آہستہ خُو گفتار میں
آنکھ میں آشفتگی، شائستگی کردار میں
رہنما بھی، راز داں بھی تھا، مرا ہمدم بھی تھا
مکتب عرفان و دانش اُس کا جامِ جم بھی تھا
دوستی اس سے رہی آدھی صدی سے مستزاد
اس کی ہر تحقیق میرے فکر کو ہے مستفاد
جب سے میرا فکر اس کے فکر سے وابستہ ہے
صاحبِ اصلِ ہدف مجھ سا خدنگ جستہ ہے
دل ہے اس کی مغفرت کو میرا، پیوستِ دُعا
اُٹھ رہا ہے آسماں کو یہ مرا دستِ دُعا

میرا مولا اُس پہ رحمت کی فراوانی کرے
''آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے''

نوٹ: استاذ الاساتذہ اقبال شناس پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا انتقال ۲۵؍جنوری ۲۰۲۴ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر خالد ندیم کا مضمون وفیات کے تحت اگلے شمارے میں ان شاء اللہ شائع ہوگا۔ (مدیر)

معارف کی ڈاک

امت کے مسائل

الحمد للہ، معارف کا تازہ شمارہ موصول ہوگیا اور اداریے سے آپ کی دردمندی کا بھی علم ہُوا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں اُمتِ مسلمہ گونا گوں مسائل و مصائب کا شکار ہے، لیکن قیادت کے فقدان سے کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں مل رہا۔ مَیں تو ایک طالب علم ہُوں، یہاں علمائے کرام بھی بے بس دِکھائی دیتے ہیں۔ نجانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح اُحد کے میدان میں جانی نقصان کے بعد قریشِ مکہ کے قبولِ اسلام نے ہمیں تقویت دی تھی یا تاتاری یلغار کے بعد کعبے کو نئے پاسبان مل گئے تھے، اسی طرح یہ آشوب بھی اپنے بطن سے نئی اُمتِ مسلمہ جنم دے گا۔

آپ کی خیریت کی اطلاع سے محروم رہا ہوں، امید تو یہی ہے کہ اب آپ کافی بہتر ہوں گے۔

خالد ندیم

dr.khalidnadeem@gmail.com

معارف: آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ ہماری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ہر بڑی مصیبت کے بعد یہ امت دوبارہ پوری طاقت سے کھڑی ہوئی ہے۔ تاتاری اور صلیبی حملوں اور سامراجی یلغار سے ہم پہلے نکل چکے ہیں۔ ان شاء اللہ اس بار بھی ایسا ہی ہوگا۔

میری طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن نارمل ہونے میں شاید چند ہفتے اور لگیں۔ دعا فرمائیں۔

(ظفرالاسلام)

مولانا اسیر ادروی کی تالیف

معارف، جنوری ۲۰۲۴ء میں پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی صاحب کے مضمون ''مولانا اسیر ادروی کی تالیف تذکرہ مشاہیر ہند: کاروان رفتہ'' میں ایک جگہ حکیم حبیب الرحمان ڈھاکا والے (م: ۱۹۴۷ء) کے ذکر کے ضمن میں یہ بات درج ہے کہ علامہ شبلی نے انھیں کشف الظنون کی طرز پر بنگال میں تصنیف ہونے والی کتب کی کتابیات تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ آگے مضمون نگار لکھتے ہیں: ''کسی ذریعے سے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ کتاب مکمل ہوکر شائع ہوگئی تھی کہ نہیں۔'' (ص ۱۳)۔ محترم مضمون نگار کی اطلاع

کے لیے عرض ہے کہ حکیم صاحب نے یہ کتاب ''ثلاثہ غسالہ'' نام سے تیار کر لی تھی۔ اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ رہی کہ اس میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی تصانیف کے کوائف جمع ہوئے ہیں۔ ''ثلاثہ غسالہ'' کا مسودہ ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری میں حکیم حبیب الرحمان کلیکشن میں محفوظ ہے۔ راقم السطور کو ۱۹۸۹ء میں مرحومہ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر (شعبہ فارسی ڈھاکا یونیورسٹی) کی کوشش سے اس کی نقل مل گئی تھی۔ اس نقل کی بنیاد پر میں نے اس کا متن تدوین کیا اور ایک مفصل مقدمے (در حالات حکیم حبیب الرحمان) اور تعلیقات اور اشاریوں کے ساتھ اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور سے ۱۹۹۵ء میں چھپوایا۔ کل ۶۴ + ۳۸۲ صفحات ہیں۔ ۲۰۲۰ء میں مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکتا نے میری مرتبہ کتاب کا ایک بلا اجازت، جعلی ایڈیشن بھی شائع کیا ہے جو کسی طرح کارآمد نہیں ہے۔ ۱۹۸۹ء میں راقم نے ثلاثہ غسالہ میں درج عربی اور فارسی تصانیف کو الگ کر کے اس کا فارسی ترجمہ کیا اور تعلیقات سمیت مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد سے جداگانہ بھی شائع کروایا۔

عارف نوشاہی

ادارہ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

معارف

اگست ۲۰۲۳ء کا معارف نظام مواصلات کی خرابی کے شکار اور محکمہ ڈاک کی شرارت کی نذر ہو جانے کے سبب بروقت نہیں مل سکا، جب کہ اس کے بعد والے شمارے موصول ہوتے رہے اور زیر مطالعہ ہو کر میرے علم و عرفان میں اضافے کے موجب بنتے رہے۔ جب انتظار کی گھڑی سخت ہو گئی اور مدت خریداری بھی ختم ہو گئی تو رسالے کے ارسال و ترسیل سے متعلقہ فرض کی انجام دہی سے وابستہ جناب ظریف الحسن سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے از راہ کرم اسے فروری کے اوائل میں بھیج کر ممنون و مشکور ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔

بہرکیف جب اس کا مطالعہ کرتے کرتے اس کے ایک مختصر لیکن مشہور و منفرد کالم 'ادبیات' پر پہنچا تو ایک الگ اور جداگانہ احساس سے دوچار ہوا جو بہت دیر اور دور تک میرا پیچھا کرتا رہا۔ واضح رہے کہ میرا یہ احساس امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی پیش کردہ نظم کے ترجمے سے متعلق ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ زندگی کے تلخ تجربات اور سفاک حقائق کی غماز و عکاس اس مترجمہ نظم کا متن بھی شامل کر لیا جاتا جس سے تقابلی لے سامنے آجاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مطالعے کی کیفیت دو چند ہو جاتی اور صہبائے ادبیات بھی دو آتشہ ہو جاتی۔

بہر حال زندگی نام ہے تبدیلیوں کا جس کی جھلک آپ کے دورِ نظامت میں معارف کے ساتھ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ البتہ کوشش یہی ہو کہ یہ تبدیلی کے وائرس کا شکار نہ ہو جائے جس سے اس کا وقار مجروح ہو جائے۔ اس کا معیار گر جائے اور سب سے بڑھ کر اس کے بانی و موسس کے لئے سوہانِ روح ہو جائے۔

''ادبیات'' میں اس خوش آئند بلکہ شوق آفریں و ذوق آگیں تبدیلی کے پیش نظر یہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ ممکنہ صورت میں اس حصے میں عربی، فارسی اور انگریزی کے ادب عالی کے فن پارے اور ادبی جواہر ریزے کو بھی شعری نمونے کی شکل میں مع ترجمہ و متن گو وقفے وقفے کے ساتھ ہی سہی پیش کیا جائے جس سے معارف کے ادبیات کا رنگ دھنک رنگ ہو جائے۔ نیز ادبیات عالم کے شعری جزیرے کی مختصر سیر بھی ہو جائے گی۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک اچھے شعر کی یہ خوبی ہے کہ وہ مختلف معنوی مدارج رکھے، اس کے پڑھنے والے اپنے اپنے طور سے اس کے شعری مفاہیم و تصورات سے گزریں اور اس کے شاعرانہ کیف و کم، زیر و بم اور پیچ و خم سے محظوظ ہوں۔

راجوخان، راجستھان

۹۱۲۲۷۸۰۱۹۸

رسید کتب موصولہ

اصطلاحات حسامی: مولانا محمد احمد سکندر قاسمی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، صفحات: ۱۲۰، سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت: درج نہیں، موبائل: ۸۹۶۰۴۴۴۸۰۵

افکارِ سلیمانی کی عصری معنویت: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۲۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰/روپے، موبائل: ۹۸۹۷۷۷۶۶۵۲

النزعات السیاسیة والاجتماعیة فی الشعر المصری المعاصر: پروفیسر محمد راشد ندوی، تقدیم ومراجعہ، ڈاکٹر تسنیم کوثر قریشی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۲۰۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل: ۹۸۱۸۸۹۷۹۷۵

تدبر قرآن تجزیاتی مطالعہ: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۲۲۴ سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰/روپے، موبائل: ۷۹۰۶۸۶۳۴۶۱

تفسیر بیان القرآن ایک جائزہ: مفتی محمد اظہار الحق قاسمی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات: ۱۵۱ سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۳۰۰/روپے، موبائل: ۷۹۰۶۸۶۳۴۶۱

داستاں میری (اول، دوم): مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، جامعہ اسلامیہ مظفرپور، اعظم گڑھ، صفحات بالترتیب: ۵۸۰و۶۳۳، سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: درج نہیں، موبائل: ۹۴۵۰۸۷۶۴۶۵

زردموسم کی نظمیں: پروفیسر مشتاق احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، صفحات: ۹۶، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۲۰۰/روپے، موبائل: ۹۴۳۱۴۱۴۵۸۶

قاری محمد قربان-حیات وخدمات: مولانا ابرار احمد فلاحی، کارسی ساتھ، گھوسی، ضلع: مئو، صفحات: ۶۷، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۵۰/روپے، موبائل: ۸۹۳۴۸۷۴۳۶۳

کلامِ اسد: حافظ اسد اللہ اشرفی مبارکپوری، مرتب: محمد شمیم شافی، المکتبة الازہریہ، رام پرساد گلی تر کہیا روڈ، گاندھی نگر، بستی، صفحات: ۲۳۲، سال اشاعت: درج نہیں، قیمت: درج نہیں، موبائل: ۶۳۰۷۹۰۳۸۶

ناگپور میں اردو نثر نگاری: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، (مہاراشٹر) صفحات: ۳۸۴، سال اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۴۰۰/روپے، موبائل: ۹۰۴۹۷۵۴۰۲۲